ماہنامہ

اشراق

لاہور

جون ۲۰۲۰ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”نبی کو نبی مان لینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنی کتاب میں خود واضح فرما دی ہے کہ نبی صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں، بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ وہ اس لیے نہیں آتا کہ لوگ اُس کو نبی اور رسول مان کر فارغ ہو جائیں۔ اُس کی حیثیت صرف ایک واعظ و ناصح کی نہیں، بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ اُس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جو ہدایت وہ دے، اُس کی بے چون وچرا تعمیل کی جائے۔“

—— مقالات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن و سنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ و تلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن و سنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول و فروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق و تنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن و سنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان و اخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم و تعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو و نما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما و صالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر و عبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگیِ قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ماہنامہ

اشراق

لاہور

جلد ۳۲ شمارہ ۶ جون ۲۰۲۰ء شوال المکرم ۱۴۴۱ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

فہرست

شذرات

فہم دین میں قدیم صحائف سے اخذ و استفادہ: جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا تقابلی مطالعہ (۱) — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: الفرقان ۲۵: ۱-۹ (۱) — جاوید احمد غامدی — ۱۴

مقالات

''میزان''----- توضیحی مطالعہ — محمد عمار خان ناصر — ۲۱

نقطۂ نظر

ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی: دینی اور سماجی تناظر میں متعلقہ مسائل کا جائزہ اور تجاویز — ڈاکٹر عرفان شہزاد — ۳۶

سیر و سوانح

حضرت علی رضی اللہ عنہ (۱۸) — محمد وسیم اختر مفتی — ۵۶

اصلاح و دعوت

حیات پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم — محمد تہامی بشر علوی — ۷۰

یسئلون

انبیا کی تعلیمات کا دائرہ — محمد حسن الیاس — ۷۶

فی شمارہ 50 روپے

سالانہ 500 روپے

رجسٹرڈ 1000 روپے

(زر تعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک

سالانہ 50 ڈالر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

سید منظور الحسن

فہم دین میں قدیم صحائف سے اخذ واستفادہ

جناب جاوید احمد غامدی کے موقف کا تقابلی مطالعہ

(۱)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دین میں قدیم آسمانی صحائف کا جو مقام بھی متعین کیا جائے، پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ان صحائف کے متن محفوظ ہیں اور لائق استناد ہیں یا تحریف شدہ ہیں اور اس بنا پر اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے رجوع کیا جائے؟اس مسئلے کے بارے میں علما کے ہاں تین مختلف آرا پائی جاتی ہیں: ایک راے یہ ہے کہ یہ اصلاً محفوظ ہیں اور جہاں تک تحریف کا تعلق ہے تو وہ ان کے متن میں نہیں، بلکہ ان کی تعبیر و تشریح میں ہوئی ہے۔ دوسری راے یہ ہے کہ اپنے متن کے لحاظ سے یہ وہ کتابیں ہی نہیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے حامل پیغمبروں پر نازل کیا تھا۔ان کا بیش تر حصہ یک سر تبدیل ہو چکا ہے۔ تیسری راے ان کے بین بین یہ ہے کہ ان میں کچھ ترمیم واضافہ تو ضرور ہوا ہے، مگران کا زیادہ تر حصہ اپنی اصل صورت ہی پر قائم ہے۔

امام ابن قیم (۶۹۱ھ-۷۵۱ھ) نے اپنی کتاب ''إغاثة اللهفان من مصايد الشيطان'' میں تورات کے حوالے سے یہی تین آرا بیان کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

وقد اختلفت أقوال الناس في التوراة	''یہود کے پاس جو تورات موجود ہے، آیا وہ
التي بأيديهم: هل هي مبدّلة أم التبديل	تبدیل شدہ ہے یا تبدیلی اور تحریف صرف اس

والتحريف وقع في التأويل دون التنزيل؟ على ثلاثة أقوال طرفين ووسط. فأفرطت طائفة وزعمت أنها كلها أو أكثرها مبدلة مغيّرة ليست التوراة التي أنزلها الله تعالىٰ علىٰ موسىٰ عليه السلام وتعرّض هؤلاء لتناقضها وتكذيب بعضها لبعض وغلا بعضهم فجوّز الاستجمار بها من البول. وقابلهم طائفة أخرىٰ من أئمة الحديث والفقه والكلام، فقالوا: بل التبديل وقع في التأويل لا في التنزيل وهذا مذهب أبي عبد الله محمد بن إسماعيل البخاري. قال في صحيحه: "يُحَرِّفُوْنَ: يزيلون. وليس أحد يزيل لفظ كتاب من كتب الله تعالىٰ ولكنهم يحرفونه: يتأوّلونه علىٰ غير تأويله." وهذا اختيار الرازي في تفسيره. وسمعت شيخنا يقول: وقع النزاع في هذه المسألة بين بعض الفضلاء فاختار هذا المذهب ووهن غيره فأنكر عليه فأحضر لهم خمسة عشر نقلًا به ومن حجة هولاء: أن التوراة قد طبّقت مشارق الأرض

کی تعبیر و تشریح میں واقع ہوئی ہے، نہ کہ اس کے الفاظ میں؟ اس بارے میں لوگوں کے ہاں تین اقوال پائے جاتے ہیں۔ دو قول انتہا پسندانہ ہیں اور ایک معتدل: چنانچہ ایک گروہ نے افراط سے کام لیا اور یہ دعویٰ کیا کہ تورات ساری کی ساری یا اس کا بیش تر حصہ تبدیل شدہ ہے اور یہ وہ تورات نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی تھی۔ انھوں نے تورات میں تناقض اور اس کے بیانات کے باہمی تضاد کو نمایاں کیا اور ان میں سے بعض نے تو اس حد تک غلو سے کام لیا کہ اس کے اوراق سے استنجا کرنے کو بھی جائز کہہ دیا۔ اس کے مقابلے میں حدیث اور فقہ اور کلام کے علما کے ایک گروہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ تورات میں تحریف صرف اس کی تعبیر و تشریح میں ہوئی ہے، نہ کہ اس کے الفاظ میں۔ یہ امام بخاری (۱۹۴ھ - ۲۵۶ھ) کا مذہب ہے۔ انھوں نے اپنی "صحیح" (کتاب التوحید، ابتدا باب ۵۵) میں کہا ہے کہ (النساء ۴: ۴۶ اور المائدہ ۵: ۱۳ میں وارد لفظ) 'یُحَرِّفُوْنَ' کے لیے 'یزیلون' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، حالاں کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں سے کسی کتاب کے الفاظ مٹا نہیں سکتا، بلکہ وہ بہ ایں معنی اس میں تحریف کرتے ہیں کہ اس کے الفاظ و کلم کے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ومغاربها وانتشرت جنوبًا وشمالًا ولا يعلم عدد نسخها إلا الله تعالٰى ومن الممتنع أن يقع التواطؤ على التبديل والتغيير في جميع تلك النسخ بحيث لا يبقٰى في الأرض نسخة إلا مبدلة مغيرة والتغيير على منهاج واحد وهذا مما يحيله العقل ويشهد ببطلانه. قالوا: وقد قال الله تعالٰى لنبيه صلى الله عليه وسلم محتجّا على اليهود بها:﴿قُلْ فَأْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾(آل عمران ۳:۹۳)... فهذا بعض ما احتجّت به هذه الفرقة. وتوسّطت طائفة ثالثة وقالوا: قد زيد فيها وغيّر ألفاظ يسيرة ولكن أكثرها باقٍ علٰى ما أنزل عليه والتبديل في يسير منها جدًا.

(۲۸۸/۲-۲۹۱)

اصل مدعا اور مفہوم سے پھیر دیتے ہیں۔ امام فخر الدین رازی (۵۴۵ھ-۶۰۶ھ) نے بھی اپنی تفسیر (مفاتیح الغیب ۱۱۷/۱۰، ۱۸۷/۱۱) میں اسی راے کو اختیار کیا ہے۔ میں نے اپنے استاذ امام ابن تیمیہ (۶۶۱ھ - ۷۲۸ھ) کو یہ کہتے سنا کہ بعض فضلا کے مابین اس مسئلے سے متعلق نزاع پیدا ہوئی تو ان میں سے ایک نے مذکورہ راے کو اختیار کیا اور مخالف قول کو کم زور قرار دیا۔ اس پر اعتراض کیا گیا تو اس نے اس کے حق میں پندرہ حوالے پیش کر دیے۔ ان اہل علم کی دلیل یہ ہے کہ تورات زمین کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پھیل چکی ہے اور اس کے نسخوں کی صحیح تعداد بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے، اور یہ بات محال ہے کہ ان تمام نسخوں میں اس طرح بالاتفاق تبدیلی واقع ہو جائے کہ روے زمین پر محرف نسخے ہی باقی رہ جائیں، اور ان سب نسخوں میں تحریف بھی ایک ہی طریقے پر کر دی جائے۔ یہ بات عقل کے نزدیک محال ہے اور وہ اس کے باطل ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ وہ مزید یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کے خلاف دلیل پیش کرتے ہوئے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ اگر تم سچے ہو تو لاؤ تورات کو اور اس کو پڑھو (آل عمران ۳:۹۳)۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

... بہر حال یہ وہ بعض دلائل ہیں جو اس راے کے قائلین پیش کرتے ہیں۔ایک تیسرے گروہ نے متوازن موقف اختیار کیا اور کہا ہے کہ اس میں چند معمولی الفاظ کا اضافہ اور تبدیلی کی گئی ہے، لیکن اس کا بیش تر حصہ اپنی اصل نازل شدہ صورت پر برقرار ہے، جب کہ تبدیلی اس کے بہت معمولی حصے میں ہوئی ہے۔‘‘

متعدد علماے امت بعض جزوی اختلافات کے ساتھ اسی تیسری راے کے قائل ہیں۔

امام ابن قیم نے اپنے اور اپنے استاذ امام ابن تیمیہ کے حوالے سے تورات کے بارے میں یہی راے نقل کی ہے۔لکھتے ہیں:

...وممن اختار هذا القول شيخنا في كتابه ”الجواب الصحيح لمن بدّل دين المسيح“... والحق أحق ما اتبع، فلا نغلو غلوّ المستهينين بها، المتمسخرين بها، بل معاذ الله من ذالک. ولا نقول: إنها باقية كما أنزلت من كل وجه، كالقرآن. (اغاثۃ اللہفان ۲/ ۲۹۱، ۲۹۵)

”...اس (تیسرے) قول کو اختیار کرنے والوں میں ہمارے استاذ (امام ابن تیمیہ) بھی شامل ہیں جنھوں نے ”الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح“ میں یہ بات کہی ہے۔... اور حق بات ہی سب سے بڑھ کر پیروی کرنے کے لائق ہے،اس لیے نہ ہم ان غلو کرنے والوں کے پیچھے چلتے ہیں جو تورات کا درجہ گراتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں، بلکہ ہم اس طرز عمل سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں،اور نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ تورات قرآن مجید کی طرح حرف بہ حرف اسی طرح موجود ہے، جیسا کہ اس کو نازل کیا گیا تھا۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) نے ایک مختلف زاویے سے یہ بیان کیا ہے کہ یہود اپنی کتاب تورات میں جو تحریف کرتے تھے، وہ اصل متن میں نہیں، بلکہ اس کے ترجمے میں کیا کرتے تھے۔اسی طرح وہ

بعض مقاصد کے تحت اصل متن کو مخفی رکھ کر اس کی ایسی تاویلات کر دیتے تھے کہ حکم کا مدعا بالکل تبدیل ہو جاتا تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب تورات کی فی الجملہ صحت کے قائل ہیں۔لکھتے ہیں:

”امادر تحریف لفظی — در ترجمۂ تورات وامثال آں بکاری بر دند، نہ دراصل تورات۔ پیش ایں فقیر اینچنیں محقق شد، وبر قولِ ابن عباس۔ و تحریفِ معنوی تاویلِ فاسد است، بحمل آیتے بر غیر معنیٔ آں بسینہ زوری وانحراف از راہِ مستقیم... وکتمانِ آیات آنست کہ بعضے احکام وآیات را برائے محافظتِ جاہِ شریفی یا برائے طلبِ ریاستی اخفاء مے نمودند، تااعتقادِ مردماں نسبتِ ایشاں متلاشی نہ شود، وبترکِ عمل باں آیات ملائم نہ شوند۔ ازاں جملہ آنست کہ رجمِ زانی در تورات مذکور ست وایشاں بنا بر اجماع احبار خود بر ترک رجم واقامت جلد و تحمیم وجہ بجائے آں، آنرا ترک کردہ بودند، واز خوفِ فضیحتے آں رامی پوشیدند۔ وازاں جملہ آنست کہ آیاتے راکہ دراں بشارتِ ہاجرہ واسماعیل علیہما السلام است بہ بعثتِ نبی درمیان اولادِ ایشاں، واشارت بوجود ملتے کہ در سرزمینِ حجاز شیوع تمام پیدا کند، وبسبب آں جبالِ عرفات بہ تلبیہ مملوء گردد، واز اطرافِ اقالیم قصد آں موضع کنند، وآں آیات تاحال در تورات ثابت است — تاویل می کردند کہ اخبار است بوجود ایں ملت نہ امر ست بأخذ آں۔ و می گفتند ملتحمۃ کتبت علینا وچوں ایں تاویلِ رکیک را ہیچ کس نمی شنید، وپیشِ ہیچ کس صحت نداشت بایک دیگر تواصی می کردند باخفاء آں وتجویز اظہار آں بہرِ خاص وعام نمی کردند۔“(الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ۸)

اس اقتباس کے مستند اردو عربی تراجم حسب ذیل ہیں:

أما التحريف اللفظي؛ فإنهم كانوا يرتكبونه في ترجمة التوراة وأمثالها، لا في أصل التوراة، هكذا الحق عند الفقير وهو قول ابن عباس، والتحريف المعنوي، تأويل فاسد يحمل الآية علىٰ غير معناها بتحكم وانحراف عن الصراط المستقيم... أما كتمان الآيات فهو أنهم كانوا يخفون بعض

”یہودی تحریف لفظی تورات کے ترجمہ وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل تورات میں۔ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہوا ہے اور ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ اور تحریف معنوی تاویل فاسد کا نام ہے، یعنی سینہ زوری اور راہ مستقیم سے انحراف کر کے کسی آیت کو اس کے اصل معنی کے خلاف پر حمل کرنا... کتمان آیات کی یہ صورت تھی کہ بعض احکام اور آیات کو کسی

الأحكام والآيات ليحافظوا علٰى جاه شريف أو لأجل رياسة يطلبونها، وكانوا يحذرون أن يضمحل اعتقاد الناس فيهم، ويلاموا بترک العمل بتلک الآيات.

ذی عزت اور شریف کے اعزاز کی حفاظت یا کسی ریاست کے حاصل کرنے کی غرض سے پوشیدہ کر دیتے تھے کہ عوام کا اعتقاد ان سے زائل نہ ہو جائے اور یہ لوگ اس پر عمل ترک کر دینے سے نشانۂ ملامت نہ بن سکیں۔

ومن جملة ذالک، أن رجم الزاني مذكور في التوراة، وكانوا يتركونه لإجماع أحبارهم علٰى ترک الرجم، وإقامة الجلد وتسحيم الوجه مقامه، ويكتمون ذالک مخافة الفضيحة.

مثلاً زانی کو سنگ سار کرنے کا حکم تورات میں مذکور تھا، مگر ان لوگوں نے اس وجہ سے کہ ان کے تمام علما نے رجم کو موقوف کر کے اس کی جگہ پر درے مارنا اور منہ کالا کر دینا تجویز کر رکھا تھا، اس حکم کو ترک کر دیا اور رسوائی کے خوف سے اس کو چھپا لیا تھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ومن جملة ذلک، أنهم كانوا يؤوّلون آيات فيها بشارة هاجر وإسماعيل عليهما الصلاة والسلام ببعثة نبي في أولادهما، وفيها إشارة بوجود ملة يتم ظهورها وشهرتها في أرض الحجاز، وتمتلئ بها جبال عرفة من التلبية، ويقصدون ذالک الموضع من أطراف الأقاليم، وهي ثابتة في التوراة إلى الآن، وكانوا يؤوّلونها بأن ذالک إخبار بوجود هذه الملة، ليس فيه أمر بالأخذ بها، وكانوا يقولون: ملحمة كتبت علينا، ولما كان هذا التأويل ركيكًا

یا مثلاً جن آیتوں میں حضرت ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام کو بشارت دی گئی ہے کہ ان کی اولاد میں ایک نبی مبعوث ہو گا اور جن میں اشارہ ہے ایک ایسے مذہب کی جانب جو سرزمین حجاز میں کامل اشاعت پائے گا۔ اور اس کے سبب سے عرفات کی پہاڑیاں صدائے لبیک سے گونج اٹھیں گی اور تمام اقلیموں کے لوگ اس مقام کی زیارت کا قصد کریں گے باوجودیکہ یہ آیتیں تورات میں اب تک موجود ہیں۔ یہودی ان کی یہ تاویل کرتے تھے کہ یہ تو فقط اس مذہب کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اس کے اتباع کا امر کہاں ہے۔ اور یہ مقولہ ان کے زبان زد تھا: 'ملحمة كتبت

فلا یسمعه أحد، ولا یکاد یصح عند أحد، کانوا یتواصون بإخفائه، ولا یجوّزون إظهاره لکل عام وخاص.
(الفوزالکبیر فی اصول التفسیر ۱۳،۱۵)

علینا‘۔ لیکن چونکہ اس رکیک تاویل کو کوئی نہ سنتا تھا اور نہ کسی کے نزدیک یہ صحیح تھی، اس لیے وہ آپس میں ایک دوسرے کو اس راز کے اخفا کی وصیت کرتے اور ہر کس و ناکس کے روبرو اس کا اظہار نہ کرتے تھے۔‘‘

مولانا مودودی بیان کرتے ہیں:

’’...تورات اُن منتشر اجزا کا نام ہے، جو سیرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر بکھرے ہوئے ہیں۔... قرآن اِنھی منتشر اجزا کو ’’تورات‘‘ کہتا ہے، اور اِنھی کی وہ تصدیق کرتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان اجزا کو جمع کر کے جب قرآن سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو بجز اس کے کہ بعض مقامات پر جزوی احکام میں اختلاف ہے، اصولی تعلیمات میں دونوں کتابوں کے درمیان یک سرِ مو فرق نہیں پایا جاتا۔ آج بھی ایک ناظر صریح طور پر محسوس کر سکتا ہے کہ یہ دونوں چشمے ایک ہی منبع سے نکلے ہوئے ہیں۔

اسی طرح انجیل دراصل نام ہے ان الہامی خطبات اور اقوال کا، جو مسیح علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری ڈھائی تین برس میں بحیثیت نبی ارشاد فرمائے۔... قرآن انھی اجزا کے مجموعے کو ’’انجیل‘‘ کہتا ہے اور انھی کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ آج کوئی شخص ان بکھرے ہوئے اجزا کو مرتب کر کے قرآن سے ان کا مقابلہ کر کے دیکھے، تو وہ دونوں میں بہت ہی کم فرق پائے گا، اور جو تھوڑا بہت فرق محسوس ہو گا، وہ بھی غیر متعصبانہ غور و تامل کے بعد بآسانی حل کیا جا سکے گا۔‘‘ (تفہیم القرآن ۱/ ۲۳۲)

کم و بیش یہی موقف ہے جو اس ضمن میں جناب جاوید احمد غامدی نے اختیار کیا ہے۔ ان کے نزدیک قدیم آسمانی کتابیں اللہ کی کتابیں ہیں جو اپنے اپنے زمانوں میں انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی تھیں۔ ان کا سرچشمہ وہی ہے جو قرآن مجید کا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ان پر بالاجمال ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ان کے مختلف حاملین نے مذہبی تعصبات کی بنا پر اگرچہ ان کے بعض اجزا ضائع کر دیے ہیں اور بعض میں تحریف کر دی ہے، اس کے باوجود ان میں الہامی شان نمایاں طور پر نظر آتی ہے اور الہامی لٹریچر کے اسالیب کو جاننے والے اس سے بہ خوبی آگاہ ہو سکتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی نے ان صحائف کے بارے میں یہ موقف اپنی تالیف ’’میزان‘‘ میں ’’کتابوں پر ایمان‘‘ کے زیر عنوان بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

"اِس وقت جو مجموعۂ صحائف بائیبل کے نام سے موجود ہے، اُس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں کسی نہ کسی صورت میں تمام پیغمبروں کو دی گئیں۔ قرآن جس طرح تورات وانجیل کا ذکر کرتا ہے، اُسی طرح صحف ابراہیم کا ذکر بھی کرتا ہے[1]۔ اِس کی تائید بقرہ و حدید کی اُن آیتوں سے بھی ہوتی ہے جو اوپر نقل ہوئی ہیں۔ یہ سب کتابیں خدا کی کتابیں ہیں۔ چنانچہ بغیر کسی تفریق کے قرآن بالاجمال اِن پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔...

...(تورات) موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اِسے بالعموم اُن پانچ صحیفوں پر مشتمل سمجھا جاتا ہے جو بائیبل کی ابتدا میں درج ہیں اور جنھیں خمسۂ موسوی (Pentateuch) کہتے ہیں، یعنی پیدایش، خروج، احبار، گنتی اور تثنیہ۔ اِن صحیفوں کا تدبر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ پہلے چار صحیفوں میں یہ تاریخی بیانات کے ساتھ اپنے نزول کی ترتیب سے نقل ہوئی ہے اور تثنیہ میں اِسے بالکل اُسی طرح ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے، جس طرح قرآن کو مرتب کیا گیا ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں غالباً یہ پانچویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت مرتب کی گئی۔ تاہم سیدنا مسیح علیہ السلام نے جس طرح اِس کا ذکر کیا ہے، اُس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی تصویب بھی اِس کو کسی حد تک حاصل ہے۔...

انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی جو ہدایت بنی آدم کو ملی ہے، اُس کے دو حصے ہیں: ایک قانون، دوسرے حکمت۔ تورات میں زیادہ تر قانون بیان ہوا ہے اور اِس کا نام بھی اِسی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ قرآن اِسے 'هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ'[2] (بنی اسرائیل کے لیے ہدایت) اور 'تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ'[3] (ہر چیز کی تفصیل) کہتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اِس میں اللہ کا حکم ہے[4]، ہدایت اور روشنی ہے[5]، لوگوں کے لیے رحمت ہے[6]۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ اِس میں یہود کی تحریفات کا ذکر کرتا ہے[7]، لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس کی

۱۔ الاعلیٰ ۸۷: ۱۹۔

۲۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۲۔

۳۔ الانعام ۶: ۱۵۴۔

۴۔ المائدہ ۵: ۴۳۔

۵۔ المائدہ ۵: ۴۴۔

۶۔ الاعراف ۷: ۱۵۴۔

۷۔ المائدہ ۵: ۱۳۔

جو روایت (version) زمانۂ رسالت کے یہود و نصاریٰ کے پاس تھی، قرآن فی الجملہ اُس کی تصدیق کرتا ہے۔

...(زبور) اُس کتاب کا نام ہے جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ نغمات الٰہی کا مجموعہ ہے جنھیں مزامیر کہا جاتا ہے۔ بائیبل کے مجموعۂ صحائف میں زبور کے نام سے جو کتاب اِس وقت شامل ہے، اُس میں ۵ دیوان اور ۱۵۰ مزامیر ہیں۔ دوسرے لوگوں کے مزامیر بھی اگرچہ اُس میں خلط ملط ہو گئے ہیں، مگر جن مزامیر پر صراحت کی گئی ہے کہ داؤد علیہ السلام کے ہیں، اُن میں الہامی کلام کی شان ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے۔ انجیل کی طرح یہ بھی ایک صحیفۂ حکمت ہے اور خدا کی نازل کردہ ایک کتاب کی حیثیت سے قرآن اِس کی تصدیق کرتا ہے۔

...(انجیل) مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اُن کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد آخری نبوت کی بشارت تھی۔ انجیل کے معنی بشارت کے ہیں اور یہ نام اِسی رعایت سے رکھا گیا ہے۔ الہامی کتابوں کے عام طریقے کے مطابق یہ بھی دعوت و انذار کی ضرورتوں کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی۔ اِس سے پہلے کہ اِسے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر کے محفوظ کیا جاتا، سیدنا مسیح علیہ السلام کو اُن کی قوم کی سرکشی کے باعث دنیا سے اٹھا لیا گیا۔ لٰہذا یہ کوئی مرتب کتاب نہیں، بلکہ منتشر خطبات تھے جو زبانی روایتوں اور تحریری یادداشتوں کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچے۔ مسیح علیہ السلام کی سیرت پر ایک مدت کے بعد بعض لوگوں نے رسائل لکھنا شروع کیے تو اُن میں یہ خطبات حسب موقع درج کر دیے گئے۔ یہی رسائل ہیں جنھیں اب انجیل کہا جاتا ہے۔ مسیحیت کے ابتدائی زمانے میں یہ اناجیل بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ ۳۸۲ء میں پوپ دماسس (Damasus) کے ماتحت ایک مجلس میں کلیسا کے مذہبی پیشواؤں نے اُن میں سے چار منتخب کر کے باقی ترک کر دیں اور اُنھیں غیر موثق (Apocryphal) قرار دے دیا۔ بائیبل کے مجموعۂ صحائف میں یہ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی اناجیل کے نام سے شامل ہیں۔ یہ ابتدا ہی سے یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں، جب کہ مسیح علیہ السلام کی زبان آرامی (Aramaic) تھی اور اُنھوں نے اپنے مواعظ اِسی زبان میں ارشاد فرمائے تھے۔ اِن کے لکھنے والے بھی مسیح علیہ السلام کے بعد اُن کے مذہب میں داخل ہوئے۔ لٰہذا اِن میں سے کوئی انجیل بھی ۷۰ء سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے، اور انجیل یوحنا تو مسیح علیہ السلام کے ایک صدی بعد غالباً ایشیاے کوچک کے شہر افسس میں کسی وقت لکھی گئی ہے۔ اِس کے باوجود سیدنا مسیح کے جو خطبات، ارشادات اور تمثیلیں اِن میں درج ہیں، اُن کی الہامی شان ایسی نمایاں ہے کہ الہامی لٹریچر کے اسالیب سے واقف کوئی شخص اُن کا انکار نہیں

کر سکتا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن جس انجیل پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے، اُس کا ایک بڑا حصہ سیرت کی اِن کتابوں میں محفوظ ہے۔'' (۱۵۵-۱۵۷)

غامدی صاحب کے درج بالا اقتباس سے زیر بحث موضوع کے بارے میں حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ تورات، زبور اور انجیل خدا کی کتابیں ہیں اور قرآن بالاجمال ان پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔

۲۔ ان میں تحریف ہوئی ہے۔

۳۔ اس کے باوجود ان میں الہامی شان نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

۴۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے جن صحائف پر ایمان کا مطالبہ کیا ہے، ان کا ایک بڑا حصہ محفوظ ہے۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

البیان

جاوید احمد غامدی

الفرقان - الشعراء

۲۵ - ۲۶

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ دونوں کا موضوع اثبات رسالت اور اُس کے حوالے سے انذار و بشارت ہے۔ دوسری سورہ میں، البتہ اُن سرگذشتوں کی تفصیل کر دی گئی ہے جن کی طرف پہلی سورہ میں بالاجمال اشارہ فرمایا ہے۔ نیز کاہن اور شاعر ہونے کا جو الزام قریش مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے تھے، اُس کی اِس سورہ میں خاص طور پر تردید کی گئی ہے۔ دونوں میں خطاب قریش سے ہے جو آپ کی صداقت کے ثبوت کے لیے اُس زمانے میں آپ سے بار بار عذاب کی کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ دوسری سورہ میں آیت ترجیع اِسی حوالے سے وارد ہوئی ہے۔

دونوں سورتوں کے مضمون سے واضح ہے کہ ام القریٰ مکہ میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرحلۂ انذار عام میں نازل ہوئی ہیں۔

———————

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة الفرقان

(۱)

www.javedahmedghamidi.com
www.al-mawrid.org

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تَبٰرَكَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾

۱

اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔

بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان[1] اتارا ہے، اِس لیے

۱۔ یعنی ایک ایسی کتاب جو حق و باطل میں امتیاز کے لیے ایک کسوٹی، ایک معیار فیصلہ اور حجت قاطع ہے۔ دوسری جگہ یہی حقیقت لفظ 'میزان' سے واضح فرمائی ہے، یعنی ایک ترازو تاکہ ہر شخص اُس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق اور کیا باطل ہے۔ چنانچہ اپنے دعاوی اور اپنے پیش کرنے والے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے بھی یہ کسی خارجی دلیل کی محتاج نہیں ہے، بلکہ بجاے خود دلیل و حجت ہے۔ قرآن کی یہی حیثیت ہے جس کی بنا پر ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' کے مقدمہ ''اصول و مبادی'' میں لکھا ہے کہ خدا کی اِس کتاب کے بارے میں یہ دو باتیں

اِلَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ

کہ وہ اہل عالم کے لیے خبردار کرنے والا ہو۲۔ وہی جس کے لیے زمین اور آسمانوں کی بادشاہی

بطور اصول ماننی چاہییں:

”پہلی یہ کہ قرآن کے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اِس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اِس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔ دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اِس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہو گا۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اِس سے شروع ہو گی اور اِسی پر ختم کر دی جائے گی۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القا، ہر تحقیق اور ہر راے کو اِس کے تابع قرار دیا جائے گا اور اِس کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے گی کہ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اِس کی حکومت قائم ہے اور اِس کے خلاف اِن میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

دوسری یہ کہ اِس کے الفاظ کی دلالت اِس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملے میں بھی اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا۔ اِس کا مفہوم وہی ہے جو اِس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں، وہ نہ اُس سے مختلف ہے نہ متبائن۔ اِس کے شہرستان معانی تک پہنچنے کا ایک ہی دروازہ ہے اور وہ اِس کے الفاظ ہیں۔ وہ اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتے ہیں، اُس میں کسی ریب و گمان کے لیے ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔“(۲۵)

۲۔ یعنی صرف ام القریٰ مکہ اور اُس کے گرد و پیش کے لوگوں کے لیے نہیں، بلکہ پورے عالم کے لیے۔ سورۂ انعام (۶) کی آیت ۱۹ میں مزید وضاحت فرمائی ہے کہ قرآن کی دعوت آنے والے تمام زمانوں کے لیے بھی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے: ’اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۣ بَلَغَ‘ (یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے کہ اِس کے ذریعے سے میں تمھیں انذار کروں اور اُن کو بھی جنھیں یہ پہنچے)۔ قرآن کی یہ حیثیت لازماً تقاضا کرتی ہے کہ بعد میں آنے والوں کے لیے بھی یہ اپنے ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے اُسی طرح قطعی رہے، جس طرح اپنے اولین مخاطبین کے لیے تھا۔ خدا کی عنایت ہے کہ ایسا ہی ہے اور اُس کی یہ کتاب اِسی قطعیت کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آیت میں ’عَلٰی عَبْدِهٖ‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ التفات خاص کا اسلوب ہے۔

شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴿۲﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ
اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا

ہے[۳]، اُس نے اپنی کوئی اولاد نہیں بنائی ہے[۴]، اُس کی بادشاہی میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہے، اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اُس کا ایک خاص اندازہ ٹھیرایا ہے[۵]۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُنھوں نے اُس کے سوا دوسرے معبود بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے، وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں اور

استاذ امام لکھتے ہیں:

"...اِس التفات کا یہاں ایک خاص محل ہے۔ آگے کفار کے وہ اعتراضات نقل ہوئے ہیں جو وہ نہایت تحقیر آمیز انداز میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ یہ اعتراضات زیادہ تر مکہ اور طائف کے دولت مندوں کے اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ اپنی مالی برتری کے گھمنڈ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیوی اسباب و وسائل سے بے تعلقی پر چوٹیں کرتے اور اِس چیز کو آپ کی رسالت کی تردید کی ایک بہت بڑی دلیل کی حیثیت سے پیش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں مستکبرین کی اِسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندۂ خاص پر 'فرقان' کی شکل میں جو نعمت عظمیٰ اتاری ہے، اُس کے بعد وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ خلق کے انذار کے وہ جس مشن پر مامور ہے، اُس کی تکمیل کے لیے وہ جس زاد و راحلہ کا محتاج ہے، وہ سب بدرجۂ کمال اُس کے پاس موجود ہے۔"

(تدبر قرآن ۵/۴۴۳)

۳۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اِس کتاب کو سائل کی درخواست نہ سمجھے۔ یہ اِس کائنات کے بادشاہ حقیقی کا فرمان واجب الاذعان ہے۔ اِسے جھٹلایا گیا تو اُس کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔

۴۔ خدا کے لیے جن لوگوں نے بیٹے اور بیٹیاں فرض کر رکھی ہیں، اُن کے بارے میں وہ لازماً اِس زعم میں مبتلا ہوتے ہیں کہ اُنھیں وہ خدا کی پکڑ سے بچا لیں گی۔ قرآن نے یہ اِسی زعم باطل کی نفی کی ہے۔

۵۔ یہ خدا کی توحید اور یکتائی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ جب وہ ہر چیز کا خالق ہے اور اُسی نے ہر چیز کے لیے صورت، جسامت، قوت و استعداد، اوصاف و خصائص، عروج و ارتقا اور بقا و زوال کے حدود و قیود متعین کیے ہیں تو کوئی دوسرا اُس کی خدائی میں کہاں سے شریک ہو گا؟ کیا کسی شخص کے لیے ممکن ہے کہ اُس کی بنائی ہوئی کسی چیز کو اُس کے ٹھیرائے ہوئے اندازے سے سر مو کم و بیش یا آگے پیچھے کر سکے؟

نَفۡعًا وَّلَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّلَا حَیٰوۃً وَّلَا نُشُوۡرًا ﴿۳﴾
وَقَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفۡکُ ۣ افۡتَرٰىہُ وَاَعَانَہٗ عَلَیۡہِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ ۚۛ
فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّزُوۡرًا ﴿۴﴾ ۚۛ وَقَالُوۡۤا اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ اکۡتَتَبَہَا فَہِیَ تُمۡلٰی

اپنے لیے بھی کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔ وہ نہ موت پر کوئی اختیار رکھتے ہیں نہ زندگی پر اور نہ مرے ہوؤں کو اٹھانا اُن کے اختیار میں ہے[۶]۔ ۱-۳

(اِس کے) منکرین کہتے ہیں کہ یہ قرآن محض جھوٹ ہے جس کو اِس شخص نے گھڑ لیا ہے[۷] اور کچھ دوسرے لوگوں نے اِس کام میں اِس کی مدد کی ہے[۸]۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے بڑے ظلم اور جھوٹ کا ارتکاب کیا ہے[۹]۔ کہتے ہیں کہ یہ اگلوں کے افسانے ہیں جو اِس نے (کسی سے) لکھوا لیے ہیں۔ سو

۶۔ مطلب یہ ہے کہ اِس سے بڑھ کر خرد باختگی کیا ہو گی کہ ایسے بے بس معبودوں کے سہارے پر قرآن کے پیش کردہ حقائق کو جھٹلا دیا جائے؟

۷۔ یعنی وحی الٰہی نہیں ہے، جس طرح کہ دعویٰ کیا جا رہا ہے، بلکہ اپنے ذہن کا گھڑا ہوا کلام ہے جسے خدا کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

۸۔ اُنھوں نے یہ بات کسی نام کی تصریح کے ساتھ اِس لیے نہیں کی کہ الزام جھوٹا ہو تو ابہام ہی کا اسلوب موزوں ہوتا ہے۔ استاذ امام کے الفاظ میں، اگر اُس کے لیے تصریح کا اسلوب اختیار کر لیا جائے تو بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ قرآن کو (معاذ اللہ) جھوٹ قرار دے کر اُس کے ساتھ یہ بات اُنھیں اِس لیے کہنا پڑی کہ قرآن میں پچھلے انبیا علیہم السلام کی سرگذشتوں کے حوالے بھی تھے۔ اُن کے بارے میں یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں پیدا ہو سکتا تھا کہ اگر یہ وحی الٰہی نہیں ہے تو آخر یہ سب باتیں اُنھی کے اندر کے ایک شخص کو اِس صحت اور تفصیل کے ساتھ کس طرح معلوم ہو گئی ہیں۔ اِس کے جواب میں اُنھوں نے اُن لوگوں کی طرف اشارہ کر دیا جو اہل کتاب میں سے آپ پر ایمان لے آئے تھے کہ یہ اُن کی سکھائی ہوئی ہیں۔ اپنی بات کو موکد کرنے کی یہ ایسی کوشش ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حق کی دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے تھے اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے تھے۔

۹۔ قرآن جس عظیم علم و حکمت کا حامل اور زبان و بیان کے لحاظ سے جس پایے کا شہ پارۂ ادب ہے اور اُس

عَلَيۡهِ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ﴿۵﴾ قُلۡ اَنۡزَلَهُ الَّذِيۡ يَعۡلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۶﴾
وَقَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِيۡ فِي الۡاَسۡوَاقِ ؕ لَوۡلَاۤ
اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَلَكٌ فَيَكُوۡنَ مَعَهٗ نَذِيۡرًا ﴿ۙ۷﴾ اَوۡ يُلۡقٰۤى اِلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ تَكُوۡنُ لَهٗ جَنَّةٌ

وہی اب صبح و شام اِس کتاب میں لکھنے کے لیے اِس کو سنائے جاتے ہیں[10]۔ اُن سے کہو کہ (یہ کتاب تو اپنے لفظ لفظ سے شہادت دے رہی ہے کہ) اِسے اُس (پروردگار) نے اتارا ہے جو زمین اور آسمانوں کے بھید جانتا ہے[11]۔ (تم جیسے سرکشوں کے لیے وہ اِس کی جگہ عذاب بھی اتار سکتا تھا، مگر) حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۴-۶

کہتے ہیں کہ یہ کیسا رسول ہے؟ یہ تو (ہماری طرح) کھانا کھاتا ہے اور (اپنی ضرورتوں کے لیے) بازاروں میں پھرتا ہے! اِس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ اِس کے ساتھ ہو کر وہ (نہ ماننے والوں کو) خبردار کرتا[12]؟ یا اِس پر کوئی خزانہ اتارا جاتا یا (زیادہ نہیں تو) اِس کے لیے کوئی باغ

میں انبیا علیہم السلام کی سرگذشتیں جس طریقے سے اور جن مضامین پر استدلال کے لیے سنائی گئی ہیں، اُن کو دیکھ کر ہر سلیم الطبع انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ جس الزام کا ذکر ہوا ہے، وہ کس قدر پوچ، کیسا لغو اور مہمل اور کتنا بے وزن ہے۔ چنانچہ یہی بات کافی تھی جو قرآن نے اُس کے جواب میں کہہ دی ہے۔ جو لوگ ایسی بالبداہت مہمل باتیں اِس ڈھٹائی کے ساتھ کہیں، اُن کی تردید میں اِس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

۱۰۔ یہ اُسی الزام کی مزید وضاحت ہے جو اوپر نقل ہوا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے 'تُمْلٰى عَلَيْهِ' کے الفاظ اِس لیے آگئے ہیں کہ جو چیز سنائی جارہی تھی، اُسے یاد کرنے والے یاد کر رہے اور لکھنے والے ساتھ ساتھ لکھ بھی رہے تھے۔

۱۱۔ مطلب یہ ہے کہ جو علم و حکمت اور ماضی، حال اور مستقبل کے جو حقائق اِس کتاب میں بیان کیے جارہے ہیں، وہ نہ کسی عربی کے لیے جاننا ممکن ہیں، نہ کسی عجمی کے لیے۔ اُن کا ماخذ علم اور منبع الہام تو وہی ذات ہو سکتی ہے جو زمین و آسمان کے سارے بھیدوں اور تمام اسرار و رموز سے واقف ہو۔ یہ بات اِس کتاب کی سطر سطر سے واضح ہے۔ اِس کے بعد خود سمجھ سکتے ہو کہ تمھارا الزام کس قدر پوچ اور مہمل ہے۔

۱۲۔ یعنی اِن کے ساتھ ساتھ پھرتا اور منادی کرتا کہ لوگو، یہ اللہ کے رسول ہیں، یہ جس چیز سے ڈرا رہے

يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾ اُنْظُرْ
كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹﴾

ہی ہوتا جس سے یہ کھاتا پیتا[۱۳] — یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔ دیکھو، (اے پیغمبر)، یہ تمھاری نسبت کیسی کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔ سو بالکل کھوئے گئے ہیں، اب کوئی راستہ نہیں پا رہے ہیں[۱۴]۔ ۷-۹

ہیں، اُس سے ڈرو، ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔

۱۳۔ مطلب یہ ہے کہ اُسی سے اپنی معاش حاصل کر لیتا اور اِسے کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ عام آدمیوں کی طرح بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرے۔

۱۴۔ یعنی حقیقت اتنی واضح ہے کہ اُس کی تردید کے لیے کوئی راستہ نہیں پا رہے ہیں۔ چنانچہ عناد اور تعصب میں اندھے ہو کر ایسی لچر اور پوچ باتیں کر رہے ہیں جن کے بارے میں خود بھی جانتے ہیں کہ اُن کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد عمار خان ناصر

"میزان" ـــــ توضیحی مطالعہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

[زیر نظر سلسلہ جناب جاوید احمد غامدی کی کتاب "میزان" کے توضیحی مطالعے پر مبنی ہے جس میں کتاب کے بنیادی مباحث اور اہم علمی نکات کا مطالعہ، بالاختصار، توضیح و تقابل کے اصول پر کیا جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ]

دین کی تعریف

"دین اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے جو اُس نے پہلے انسان کی فطرت میں الہام فرمائی اور اِس کے بعد اُس کی تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسان کو دی ہے۔ اِس سلسلہ کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ چنانچہ دین کا تنہا ماخذ اِس زمین پر اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے۔ یہ صرف اُنھی کی ہستی ہے کہ جس سے قیامت تک بنی آدم کو اُن کے پروردگار کی ہدایت میسر ہو سکتی اور یہ صرف اُنھی کا مقام ہے کہ اپنے قول و فعل اور تقریر و تصویب سے وہ جس چیز کو دین قرار دیں، وہی اب رہتی دنیا تک دین حق قرار پائے۔" (میزان ۱۳)

دین کی اس تعریف میں دو نکتے بنیادی ہیں: پہلا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا کا آخری پیغمبر ہونا اور دوسرا، قیامت تک کے لیے دین کا تنہا ماخذ ہونا۔ ان دونوں نکتوں کے بعض اہم مضمرات ہیں جو پیش نظر ہونے چاہییں۔

’دین کا تنہا ماخذ‘ ہونے کا ایک واضح مطلب تو یہ ہے کہ آپ کی وساطت کے بغیر ہدایت الٰہی کے کسی بھی جزو، یہاں تک کہ اللہ کی کتاب تک رسائی یا اس پر ایمان کی بھی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان اصلاً واساساً اور براہ راست قرآن پر ایمان نہیں لاتا، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتا ہے، جب کہ قرآن کو خدا کا کلام ماننا اس کے بعد، آپ کی رسالت پر ایمان کے ایک لازمی تقاضے کے طور پر ضروری ٹھیرتا ہے۔

اس کا دوسرا اور اہم ترین مطلب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مستقل تشریعی حیثیت کا اثبات ہے۔ اس لحاظ سے یہ تصریح ان گروہوں کی گم راہی کا ازالہ کرتی ہے جو قرآن مجید کے ابلاغ وتبلیغ سے ہٹ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تشریعی مقام تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ ”ایمانیات“ کے باب میں ”نبی کی اطاعت“ کے زیر عنوان، سورۂ نساء (۴) کی آیت ۶۴ اور ۸۰ سے استدلال کرتے ہوئے مصنف نے اس نکتے کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ”نبی کو نبی مان لینے کا لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کے حکم سے اُس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنی کتاب میں خود واضح فرما دی ہے کہ نبی صرف عقیدت ہی کا مرکز نہیں، بلکہ اطاعت کا مرکز بھی ہوتا ہے۔ وہ اس لیے نہیں آتا کہ لوگ اُس کو نبی اور رسول مان کر فارغ ہو جائیں۔ اُس کی حیثیت صرف ایک واعظ وناصح کی نہیں، بلکہ ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ اُس کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جو ہدایت وہ دے، اُس کی بے چون وچرا تعمیل کی جائے۔... اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ہدایت نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے دیتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اصلی مقصود تو خدا کی اطاعت ہے، مگر اِس کا طریقہ ہی یہ ہے کہ اُس کے نبیوں کی اطاعت کی جائے۔“ (میزان ۱۴۸)

مدعا یہ ہے کہ کسی انسان کو پیغمبر ماننے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے اس کا دین لوگوں تک پہنچانے پر مامور ہے اور وہ جو چیز بھی اس اعلان کے ساتھ لوگوں کو دے گا کہ یہ خدا کا دین ہے، اسے ماننا لازم ہو گا۔ وہ خدا کے نازل کردہ کلام کے طور پر کوئی چیز پیش کرے یا اس کے علاوہ کوئی حکم یا ہدایت، یہ کہہ کر لوگوں کو دے کہ یہ خدا کا دین ہے، ہر صورت میں اس کے پیش کردہ دین کو ماننا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ اس پہلو سے ”کتابوں پر ایمان“ کے زیر عنوان مصنف کا یہ اشارہ بھی بہت اہم ہے کہ ”انسان کی ہدایت کے لیے جس طرح نبی بھیجے گئے، اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ اپنی کتابیں بھی نازل کی ہیں۔ یہ کتابیں اِس لیے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نازل کی گئیں کہ خدا کی ہدایت لکھی ہوئی اور خود اُس کے الفاظ میں لوگوں کے پاس موجود رہے" (میزان ۱۵۵)۔ یعنی ہدایت اور اتمام حجت کے باب میں خدا کے نمایندے کی حیثیت اصلاً انبیا کو حاصل ہے، جب کہ کتابیں ان کی تائید اور ان کے ذریعے سے دی جانے والی ہدایت کو محفوظ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت کا اعلان کرنے کے بعد اگر کلام الٰہی کے طور پر قرآن کو سرے سے پیش ہی نہ کرتے اور اس کے بجاے محض یہ فرماتے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور اس حیثیت سے تمھیں فلاں بات کا حکم دیتا اور فلاں بات سے روکتا ہوں تو بھی اس کی اطاعت بدیہی طور پر لازم ہوتی، کیونکہ اس کے بغیر آپ کو "رسول" ماننے کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا۔

خدا کا آخری پیغمبر ہونے کا نکتہ بھی دو اہم مضمرات کو متضمن ہے:

ایک یہ کہ آپ کے بعد نبوت و رسالت اور وحی و الہام کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے اور آپ کے بیان کردہ دین و شریعت کو ہی قیامت تک خدا کے حتمی اور آخری فرمان واجب الاذعان کی حیثیت حاصل ہے۔

دوسرا اہم مضمر یہ ہے کہ آپ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت انسانوں کو پہلی مرتبہ نہیں، بلکہ آخری مرتبہ دی گئی ہے، یعنی آپ نے ہدایت الٰہی کے مشمولات تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک نئی دریافت کے طور پر پیش نہیں کیے، بلکہ آپ کی بعثت، سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی کے طور پر اور انبیا کے جاری کردہ پورے سلسلۂ ہدایت کے تاریخی پس منظر میں ہوئی ہے۔

اس نکتے کی مزید تفصیل مصنف نے "مبادی تدبر قرآن" کے تحت "دین کی آخری کتاب" کے زیر عنوان بیان کی ہے اور واضح کیا ہے کہ قرآن مجید جن دینی مقدمات کو پہلے سے موجود اور مخاطبین کے لیے معلوم و معروف تصور کر کے اپنی دعوت پیش کرتا ہے، وہ تین ہیں: ۱۔ فطرت کے حقائق، ۲۔ دین ابراہیمی کی روایت، اور ۳۔ نبیوں کے صحائف۔ ان میں سے دین ابراہیمی کی روایت قرآن مجید کی دعوت اور خطاب میں ضمنی و اضافی طور پر زیر بحث آتی ہے، جب کہ اس کے عملی احیا اور تجدید کا عمل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے انجام پایا ہے۔ تاہم بہ حیثیت مجموعی دین کے فہم میں دینی روایت کے اس پورے تاریخی پس منظر کو ملحوظ رکھنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

سنت کی تعریف

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی تجدید و اصلاح

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کے بعد اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن میں آپ کو ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ روایت بھی اُسی کا حصہ ہے۔'' (میزان ۱۴)

سنت کی اس تعریف میں پہلا بنیادی اور اہم ترین نکتہ سنت کا ''دین ابراہیمی کی روایت'' پر مبنی ہونا ہے۔ مصنف کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید اس کا ذکر پہلے سے موجود ایک معروف اور مسلم دینی روایت کی حیثیت سے کرتا اور اس کی اتباع کا حکم دیتا ہے۔ اس حکم کی پیروی میں ملت ابراہیمی کی تجدید واصلاح اور ضروری اضافوں کے ساتھ اس روایت کو امت مسلمہ میں دین کی حیثیت سے جاری کرنے کی ذمہ داری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تفویض کی گئی اور اس باب میں آپ ہی کی تقریر وتصویب اور قول وفعل کو بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، جب کہ قرآن اس کی توضیح اور اس میں ضروری اصلاحات کا بیان ایک ثانوی ماخذ کی حیثیت سے کرتا ہے۔ دین ابراہیمی کی اسی تجدید واصلاح شدہ اور امت مسلمہ میں جاری کردہ روایت کے لیے مصنف نے ''سنت'' کا عنوان اختیار کیا ہے جو مصنف کی اپنی وضع کردہ خاص اصطلاح ہے۔ آگے چل کر ''مبادی تدبر سنت'' کے زیر عنوان مصنف نے سات اصول بیان کیے ہیں جن کی روشنی میں سنت کے مذکورہ مشمولات کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ اصول اس اصطلاح کی ضروری قیود وتحدیدات اور ان کی علمی بنیادوں کی بھی وضاحت کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت ابراہیمی کی اتباع کے حکم کی تعبیر میں علماے اصول اور مفسرین کے ہاں مختلف زاویہ ہاے نظر دکھائی دیتے ہیں۔ (ان پر تفصیلی روشنی ایک سابقہ تحریر میں ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں اس کا خلاصہ ذکر کیا جا رہا ہے)۔

ایک گروہ کا رجحان یہ ہے کہ ملت ابراہیمی کی اتباع سے خاص طور پر عقیدۂ توحید پر ایمان لانا ہے، جب کہ شرعی وعملی احکام یہاں مراد نہیں ہیں، کیونکہ وہ مختلف انبیا کے لیے مختلف رہے ہیں اور زمانہ وحالات کے تغیر سے ان میں تغیر بھی واقع ہوتا رہا ہے۔

دوسرے گروہ کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم، عقائد واحکام، دونوں میں ملت ابراہیمی کی اتباع پر مامور تھے، سواے ان احکام کے جن کو منسوخ کر دیا گیا ہو۔

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا تھا، تاہم یہ ملت ابراہیمی کے حوالے سے کوئی خصوصی حکم نہیں تھا، بلکہ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تمام انبیا سابقین کی شریعتوں کے احکام محکم اور غیر منسوخ تھے اور جب تک ان شرائع میں سے کسی حکم کے متبادل کے طور پر نیا حکم نہ

دیا جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تورات وانجیل اور دیگر انبیا کو دیے گئے شرعی احکام کی پابندی پر بھی مامور تھے۔

جن علما کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر ملت ابراہیمی کی اتباع پر مامور تھے، ان کے مابین پھر اس سوال کے حوالے سے اختلاف ہے کہ آپ کی بعثت کے وقت ملت ابراہیمی کی تفصیلات اہل عرب میں کس حد تک محفوظ تھیں اور کیا انھیں اہل عرب کی دینی روایت سے اخذ کیا جا سکتا تھا یا ان کو جاننا سرتاسر وحی الٰہی پر منحصر تھا؟

ابن حزم کی راے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے از سر نو شریعت ابراہیمی کے اصل احکام وشرائع کا علم دیا گیا تھا، گویا ابن حزم وہ ملت ابراہیمی کی اتباع کے حکم کو اہل عرب کی دینی روایت کے پس منظر میں نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ایک اصولی حکم تصور کرتے ہیں جس کی تفصیلات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست وحی کے ذریعے سے بتائی گئیں۔

امام شاطبی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اہل عرب نے ملت ابراہیمی میں بہت کچھ تحریفات اور بدعات شامل کر دی تھیں جن کی وجہ سے ملت ابراہیمی بہ حیثیت مجموعی اپنی تفصیلات میں محو ہو چکی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت تک اس کے چند گنے چنے احکام ہی محفوظ رہ گئے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، بدعات و تحریفات کی اصلاح کے ساتھ، اپنی شریعت کا حصہ بنا لیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مصنف کی راے اس باب میں شاہ ولی اللہ کے موقف کے قریب تر ہے، جو فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت تمام انبیا کے باب میں یہی رہی ہے کہ انھیں جس قوم میں مبعوث کیا جائے، وہ اس کے ہاں پہلے سے موجود مذہبی و معاشرتی روایت ہی پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھتے ہیں اور اسی میں ضروری اصلاح واضافہ کے ساتھ اسے شریعت کے طور پر جاری کر دیتے ہیں۔ اس سنت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ بنی اسمٰعیل میں ہوئی تھی جو ملت ابراہیمی کے وارث تھے اور بعض تحریفات کے باوجود اس ملت کے بیش تر اصولی وفروعی احکام ان کے ہاں متوارث چلے آ رہے تھے، اس لیے یہ ضروری تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی ملت کے احیا اور تجدید واصلاح کی ذمہ داری تفویض کی جائے۔ شاہ صاحب نے ان تمام عقائد و تصورات اور مذہبی و معاشرتی احکام کی تفصیل بھی بیان کی ہے جو اہل جاہلیت کے ہاں معروف و مسلم تھے اور جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنیاد قرار دے کر ضروری اصلاح واضافہ کے ساتھ اسے آخری شریعت کی شکل دے دی (حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۳۶۰-۳۷۰)۔

سنت اور ابراہیمی روایت کے باہمی تعلق کے حوالے سے دوسرا اہم نکتہ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ ابراہیمی روایت

کی قید یہاں شرط کی حیثیت سے مذکور نہیں، بلکہ اس کی بنیادی اہمیت اس تاریخی تسلسل کو واضح کرنے کے پہلو سے ہے جو دین ابراہیمی کی پہلے سے چلی آنے والی روایت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ سنت کے مابین پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی ہر گز ملت ابراہیمی کے احکام کی تجدید اور احیا تک محدود نہیں تھا، آپ خود ایک صاحب شریعت پیغمبر تھے اور مستقل تشریعی اختیار رکھتے تھے، اس لیے ابراہیمی روایت کی تجدید واصلاح کے علاوہ اس میں اضافے کرنا اور بہ حیثیت مجموعی اسے ایک نیا قالب دینا بھی آپ کی ذمہ داری اور اختیار کا حصہ تھا۔ مصنف نے ایک دوسرے مقام پر اس حوالے سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت یوں کی ہے:

”... سنت کے ذریعے سے جو دین ملا ہے، اُس کا ایک بڑا حصہ دین ابراہیمی کی تجدید واصلاح پر مشتمل ہے۔ تمام محققین یہی مانتے ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس میں محض جزوی اضافے کیے ہیں۔ ہر گز نہیں، آپ نے اِس میں مستقل بالذات احکام کا اضافہ بھی کیا ہے۔...اِس لیے یہ الزام بالکل لغو ہے کہ پہلے سے موجود اور متعارف چیزوں سے ہٹ کر کوئی نیا حکم دینا یا دین میں کسی نئی بات کا اضافہ کرنا میرے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن مجید کے دائرۂ کار میں شامل ہی نہیں ہے۔“ (مقامات ۱۶۲-۱۶۳)

اس کی مزید وضاحت اس سے ہوتی ہے کہ مصنف نے سنت کی تعریف میں ”دین ابراہیمی کی روایت“ کا ذکر کرنے کے باوجود سنت کی تعیین کے اصولوں میں ایسا کوئی اصول بیان نہیں کیا جو ایسے امور کو جو دین ابراہیمی کی روایت میں شامل نہیں تھے، سنت سے خارج قرار دیتا ہو۔ اسی طرح سنت کے تاریخی ثبوت کا نقطۂ حوالہ بعثت نبوی سے پہلے دین ابراہیمی کی روایت کو نہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ کی امت کے اجماع وتواتر کو قرار دیا ہے جس کا تعلق، ظاہر ہے، ملت ابراہیمی کی روایت کی اس نئی تشکیل سے ہے جس میں اصل اتھارٹی کی حیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل تھی۔

سنت کے مشمولات

ملت ابراہیمی کے جن احکام کی تجدید واصلاح اور ان میں بعض اضافوں کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سنت کی حیثیت سے امت میں جاری فرمایا، ان کی فہرست مصنف نے یوں بیان کی ہے:

”عبادات

۱۔ نماز۔ ۲۔ زکوٰۃ اور صدقۂ فطر۔ ۳۔ روزہ واعتکاف۔ ۴۔ حج وعمرہ۔ ۵۔ قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں۔

معاشرت

۱۔ نکاح وطلاق اوراُن کے متعلقات۔ ۲۔ حیض ونفاس میں زن وشو کے تعلق سے اجتناب۔

خور ونوش

۱۔ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت۔ ۲۔ اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔

رسوم وآداب

۱۔ اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ ۲۔ ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اُس کا جواب۔ ۳۔ چھینک آنے پر 'الحمد للّٰہ' اور اُس کے جواب میں 'یرحمك اللّٰہ'۔ ۴۔ مونچھیں پست رکھنا۔ ۵۔ زیر ناف کے بال کاٹنا۔ ۶۔ بغل کے بال صاف کرنا۔ ۷۔ بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ ۸۔ لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ ۹۔ ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ ۱۰۔ استنجا۔ ۱۱۔ حیض ونفاس کے بعد غسل۔ ۱۲۔ غسل جنابت۔ ۱۳۔ میت کا غسل۔ ۱۴۔ تجہیز وتکفین۔ ۱۵۔ تدفین۔ ۱۶۔ عیدالفطر۔ ۱۷۔ عید الاضحیٰ۔'' (میزان ۱۴)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کتاب میں متعلقہ مقامات پر مذکورہ احکام کی نوعیت واضح کرتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ ان میں سے بیش تر احکام ملت ابراہیمی کے احکام وشرائع کے طور پر عرب جاہلیت میں معلوم ومعروف تھے، اہل عرب کی دینی روایت میں ان پر عمل جاری تھا اور ان میں سے کسی بھی حکم کا تعارف ایک نئے حکم کے طور پر ابتداءً کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان میں سے صرف چند احکام، مثلاً عید الفطر اور عید الاضحیٰ، ایسے ہیں جن کی نوعیت مستقل بالذات احکام کی ہے، لیکن وہ دین ابراہیمی کی روایت کا حصہ نہیں تھے، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنے تشریعی اختیار کے تحت مسلمانوں کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ ان کے علاوہ باقی جملہ امور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی نوعیت ملت ابراہیمی کے احکام کی تجدید کی ہے، جن میں ضروری اصلاح وترمیم کا عمل حسب مصلحت قرآن اور سنت، دونوں ذریعوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا گیا ہے۔

مبادی تدبر سنت

سنت کی تعریف، اس کا تاریخی پس منظر اور اس کے مشمولات کی وضاحت کے بعد زیر نظر عنوان کے تحت مصنف نے توضیح مزید کے لیے تعیین سنت کے رہنما علمی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے، جس سے وہ فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے جو 'سنت' کے اصطلاحی مفہوم کے حوالے سے جمہور اہل علم اور مصنف کے مابین پایا جاتا ہے۔

بیان کردہ سات اصولوں میں سے ہر اصول کسی نہ کسی پہلو سے یہ واضح کرتا ہے کہ بہت سے امور، جن پر جمہور اہل علم وسیع تر مفہوم میں 'سنت' کا اطلاق کرتے ہیں، مصنف نے اپنی اصطلاح کے مطابق انھیں 'سنت' میں کیوں شمار نہیں کیا۔

مصنف کی اصطلاح کے لحاظ سے 'سنت' کے مفہوم میں حسب ذیل قیود اور تحدیدات ملحوظ ہیں:

۱۔ سنت میں وہی امور شامل سمجھے جائیں گے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے، 'دین' ہوں۔

۲۔ سنت کا اطلاق صرف عملی نوعیت کی چیزوں پر کیا جائے گا، جب کہ علمی وتاریخی نوعیت کی توضیحات اس کے دائرۂ اطلاق سے خارج ہوں گی۔

۳۔ سنت کے دائرے میں صرف وہی احکام شمار کیے جائیں گے جن کی ابتدا قرآن مجید سے نہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل اور تقریر وتصویب سے ہوئی ہے۔

۴۔ سنت کا اطلاق مستقل بالذات اصولی احکام پر کیا جائے گا، جب کہ ان کے فروع کو مستقل سنت شمار نہیں کیا جائے گا۔

۵۔ امور فطرت، جنھیں باقاعدہ طور پر دینی احکام کا درجہ دے کر اس حیثیت سے امت کے عمل میں جاری نہ کیا گیا ہو، سنت میں شمار نہیں ہوں گے۔

۶۔ سنت وہی ہو گی جسے امت کے اجتماعی عمل میں جاری کیا گیا ہو، جب کہ انفرادی سطح پر کیے گئے یا تجویز کردہ اعمال کو سنت سے الگ 'اسوۂ حسنہ' کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

۷۔ سنت کا اطلاق انھی امور پر کیا جائے گا جو باعتبار ثبوت مجمع علیہ اور متواتر ہوں۔

سنت کے دائرے سے خارج مذکورہ امور کی نوعیت کی وضاحت کے لیے مصنف نے تفہیم و تبیین، بیان فطرت، اجتہاد اور اسوۂ حسنہ وغیرہ کی تعبیرات اختیار کی ہیں، جن کی ضروری توضیح ''مبادی تدبر حدیث'' کے تحت کی جائے گی۔

ذیل میں ان میں سے ہر اصول اور اس کی علمی اساسات کی ضروری توضیح پیش کی جائے گی:

''پہلا اصول یہ ہے کہ سنت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دین ہو۔'' (میزان ۵۸)

یہ اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو الگ الگ حیثیتوں میں فرق کی وضاحت کرتا ہے۔ آپ کی ایک حیثیت باقی تمام انسانوں کی طرح ایک انسان کی تھی، جس کی بہت سی طبعی وجبلی اور اسی طرح سماجی وتمدنی ضروریات

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تھیں جن کی تکمیل آپ نے اپنی شخصی طبیعت و مزاج اور ذاتی پسند و ناپسند کے تحت یا اپنی معاشرت اور تمدن کے عرف و رواج کے تحت فرمائی۔ آپ کی دوسری حیثیت اللہ کے مبعوث کردہ پیغمبر کی تھی اور اس حیثیت میں آپ انسانوں کی رہنمائی کرنے اور ان کے لیے امور زندگی سے متعلق احکام و ضوابط متعین کرنے پر مامور تھے۔ جمہور علماے امت دوسری نوعیت کے معاملات میں آپ کے احکام کی اتباع کو لازم قرار دیتے ہوئے پہلی نوعیت کے امور میں آپ کے اقوال وافعال کو واجب الاتباع قرار نہیں دیتے۔ اس اصول کی وضاحت اصول فقہ کی تمام امہات کتب میں کی گئی ہے اور خاص طور پر ابن تیمیہ، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ اور ابن عاشور کی تحریروں میں اس فرق پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے (ابن تیمیہ، اقتضاء الصراط المستقیم ۲/ ۵۳۷۔ مقدمہ ابن خلدون ۶۵۱۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۲۲۳۔ ابن عاشور، مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ ۱۲۸)۔

شاہ ولی اللہ نے اس فرق کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے دین میں تحریف کے اسباب میں سے ایک سبب اس بات کو قرار دیا ہے کہ آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل کو عبادت، یعنی دینی عمل پر محمول کرے اور سمجھے کہ آپ کا ہر عمل شریعت کے اوامر ونواہی میں داخل ہے، حالاں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے کام عادت کے طور پر، یعنی عام انسانی تقاضوں کے تحت بھی کیے ہیں (حجۃ اللہ البالغہ ۱/ ۲۱۱)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

”دوسرا اصول یہ ہے کہ سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے، یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں۔ علم و عقیدہ، تاریخ، شان نزول اور اِس طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ (میزان ۵۹)

یہ اصول بھی اصطلاح کے ایک اہم فرق کو واضح کرتا ہے۔ محدثین 'سنت' کی تعبیر بہ حیثیت مجموعی ان تمام امور کے لیے اختیار کرتے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، چاہے ان کا تعلق عقیدہ و علم سے ہو یا دینی اعمال سے۔ فقہا و اصولیین بھی ایک عمومی تعبیر کے طور پر ان سب چیزوں کے لیے 'سنت' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، تاہم دینی اعمال کی درجہ بندی کی بحث میں یہ لفظ ان کے ہاں ایک مخصوص اصطلاحی مفہوم میں، فرض اور واجب کے تقابل میں بھی مستعمل ہے۔ اس کی رو سے 'سنت' کا اطلاق ایسے دینی اعمال پر کیا جاتا ہے جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کے ساتھ مستقلاً ادا کرنے کا اہتمام کیا ہو یا اس کی ترغیب دی ہو، لیکن انھیں امت پر فرض یا واجب نہ ٹھیرایا ہو۔ اس کی مثال فرض نمازوں سے پہلے یا بعد میں پڑھے جانے والے نوافل ہیں جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہتمام سے ادا فرمایا کرتے تھے، لیکن وہ فرض یا واجب نہیں ہیں۔ اس اصطلاح کے مطابق، نہ صرف یہ کہ عقیدہ و علم 'سنت' کے دائرے میں نہیں آتے، بلکہ عملی احکام کی بھی صرف ایک خاص

قسم پر ہی 'سنت' کا اطلاق کیا جاتا ہے، جب کہ فرائض یا واجبات میں شمار ہونے والے اعمال بھی 'سنت' میں شامل نہیں سمجھے جاتے۔

مصنف نے زیر بحث اصول میں اپنی اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے اس کی ایک خاص تحدید کو واضح کیا ہے، یعنی یہ کہ 'سنت' کا اطلاق عملی نوعیت کی چیزوں پر ہی ہو گا، جب کہ علمی اور تاریخی نوعیت کے امور اس کے دائرے میں شامل نہیں سمجھے جائیں گے۔ یہ واضح رہے کہ عملی نوعیت کی تمام چیزیں بھی مصنف کی اصطلاح کے مطابق 'سنت' میں شامل نہیں، بلکہ اس دائرے میں مختلف نوعیت کی مزید تحدیدات ہیں جن کی وضاحت آیندہ اصولوں کے تحت کی گئی ہے۔

"تیسرا اصول یہ ہے کہ عملی نوعیت کی وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہو سکتیں جن کی ابتدا پیغمبر کے بجاے قرآن سے ہوئی ہے۔... کسی چیز کا حکم اگر اصلاً قرآن پر مبنی ہے اور پیغمبر نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے یا اُس پر طابق النعل بالنعل عمل کیا ہے تو پیغمبر کے اِس قول و فعل کو ہم سنت نہیں، بلکہ قرآن کی تفہیم و تبیین اور اسوۂ حسنہ سے تعبیر کریں گے۔ سنت صرف اُنھی چیزوں کو کہا جائے گا جو اصلاً پیغمبر کے قول و فعل اور تقریر و تصویب پر مبنی ہیں اور اُنھیں قرآن کے کسی حکم پر عمل یا اُس کی تفہیم و تبیین قرار نہیں دیا جا سکتا۔" (میزان ۶۰)

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

یہ اصول سنت کے، قرآن سے الگ ایک مستقل بالذات ماخذ ہونے کے تصور کی فرع ہے اور اس نکتے کو واضح کرتا ہے کہ امور دین کی تشریح میں اس بات کو ملحوظ رکھا جائے گا کہ کون سی بات کا ماخذ اصلاً قرآن ہے اور کون سی بات ابتداءً سنت سے ثابت ہوئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کسی بات کے محض قرآن مجید میں مذکور ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن اسے ابتداءً بیان کر رہا ہے اور سنت میں اس سے متعلق جو بھی تفصیلات وارد ہوئی ہیں، وہ قرآن پر متفرع ہیں۔ مستقل بالذات احکام کو ابتداءً بیان کرنا قرآن کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ اس میں قرآن کے ساتھ سنت بھی شریک ہے۔ جس طرح قرآن دین کے بہت سے مستقل بالذات احکام بیان کرتا اور سنت، قرآن سے ثابت احکام کے طور پر ان کا ذکر کرتی ہے، اسی طرح سنت بھی ایسے مستقل بالذات احکام بیان کرتی ہے جن کی ابتدا قرآن سے نہیں ہوئی، اور پھر قرآن ان کا ذکر ایک ثابت شدہ حکم کے طور پر کرتے ہوئے ان کے بعض مزید پہلوؤں سے تعرض کرتا ہے۔

ایک دوسرے پہلو سے یہ اصول یہ بھی واضح کرتا ہے کہ بیان احکام میں اصل اور فرع کا رشتہ صرف یک طرفہ نہیں ہے، یعنی ایسا نہیں کہ قرآن مجید ہی مطلقاً اصل ہے اور سنت ہمیشہ اس کی فرع ہوتی ہے، بلکہ یہ تعلق دو طرفہ

ہے،اس لیے ایک ہی حکم سے متعلق قرآن اور سنت، دونوں میں احکام وارد ہوں تو یہ تحقیق ضروری ہے کہ کسی مسئلے کو ابتداءً قرآن یا سنت میں سے کس نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ جیسے یہ امکان ہے کہ کسی حکم کو اصلاً و ابتداءً قرآن نے بیان کیا ہو اور سنت نے اس کی مختلف فروع کی وضاحت کی ہو، اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس مسئلے میں تشریع کی ابتدا سنت سے ہوئی ہو اور اسی نے اس باب میں بنیادی و تاصیلی ماخذ کا کردار ادا کیا ہو، جب کہ قرآن نے اس کو ایک ثابت شدہ حکم مان کر اس پر بعض مزید احکام کا اضافہ کیا ہو۔ یوں تشریع کی ابتدا کرنے میں قرآن اور سنت، دونوں مساوی درجے کے ماخذ ہیں اور دونوں اپنی مستقل حیثیت میں دین کے تاصیلی احکام بھی بیان کر سکتے ہیں اور پہلے سے ثابت شدہ احکام میں اضافات بھی شامل کر سکتے ہیں۔ پہلی صورت کی مثال کے طور پر مصنف نے چوروں کے ہاتھ کاٹنے، زانیوں کو کوڑے مارنے، اوباشوں کو سنگ سار کرنے اور منکرین حق کے خلاف جہاد جیسے افعال کا ذکر کیا ہے، جن کا بنیادی ماخذ قرآن ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے حکم کی پیروی میں ان افعال کو بجالایا ہے۔ دوسری صورت کی مثال نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قربانی جیسے مسائل ہیں جو دین ابراہیمی کی روایت کا حصہ تھے جس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تجدید کی۔ یوں ان کی ابتدا اصلاً سنت سے ہوئی ہے، جب کہ قرآن نے ان کا ذکر محض تصویب اور تاکید کے پہلو سے کیا ہے۔

اس اصول کے بعض مضمرات قرآن مجید کے فہم اور تفسیر سے متعلق ہیں جن کی وضاحت ''مبادی تدبر قرآن'' کے تحت ''دین کی آخری کتاب'' کے ذیل میں کی جائے گی۔

''چوتھا اصول یہ ہے کہ سنت پر بطور تطوع عمل کرنے سے بھی وہ کوئی نئی سنت نہیں بن جاتی۔'' (میزان ۶۰)

یہ اصول اصطلاح کے حوالے سے دو اہم فروق کو متضمن ہے:

ایک یہ کہ جمہور علماے اصول کے نقطۂ نظر سے فرض عبادات، مثلاً نماز اور روزہ کا اصل ماخذ قرآن مجید ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے حکم کی پیروی میں عمل کیا، جب کہ نفل عبادات جو آپ نے اپنے ذوق کے تحت اختیار کیں اور انھیں امت کے لیے مشروع فرمایا، ان کا ماخذ 'سنت' ہے۔ اس کے برعکس، مصنف کے نزدیک مذکورہ عبادات کا اصل ماخذ سنت ہی ہے، جب کہ قرآن نے ان کا ذکر صرف تائید و تاکید کے لیے کیا ہے۔ یوں یہ عبادات، چاہے فرض ہوں یا نفل، اصلاً سنت کے دائرے میں آتی ہیں۔ اس نکتے کی مزید توضیح تیسرے اصول کے تحت کی جا چکی ہے۔

دوسرا یہ کہ جمہور علماے اصول، فرض عبادات کا اصل ماخذ قرآن کو قرار دیتے ہوئے بھی، جب توسعاً ان کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نسبت سنت کی طرف کرتے ہیں تو پھر فرض اور نفل عبادات میں کسی امتیاز کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور علی الاطلاق 'سنت' کو دونوں طرح کی عبادات کا ماخذ قرار دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف، مصنف ان دونوں کو الگ الگ قسموں میں رکھنا اور الگ الگ اصطلاحات سے ان کی نوعیت کو واضح کرنے کو اہم اور ضروری تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق صرف ایسے امور 'سنت' کی تعریف میں شامل سمجھے جائیں گے جن کی نوعیت مستقل بالذات حکم کی ہو، یعنی وہ کسی دوسرے حکم کی فرع نہ ہوں، نیز انھیں امت کے اجتماعی عمل میں اہتمام کے ساتھ جاری کیا گیا ہو۔ اس اصول کے مطابق پنج گانہ نماز اور رمضان کے روزے تو مستقل بالذات حکم ہونے کی بنیاد پر 'سنت' کے تحت آتے ہیں، جب کہ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفلی عبادت کی جو بھی صورتیں مروی ہیں، وہ کوئی الگ اور مستقل 'سنت' نہیں ہیں، بلکہ اسی بنیادی سنت کی ادائیگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے ذیل میں آتی ہیں جو آپ نے قرآن مجید کی ہدایت 'وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا'[1] کے تحت اختیار فرمائیں۔

اس تحدید کی ضرورت اور افادیت کو واضح کرتے ہوئے مصنف نے ایک دوسری بحث میں لکھا ہے:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو قرآن دیا ہے۔ اِس کے علاوہ جو چیزیں آپ نے دین کی حیثیت سے دنیا کو دی ہیں، وہ بنیادی طور پر تین ہی ہیں:

۱۔ مستقل بالذات احکام وہدایات جن کی ابتدا قرآن سے نہیں ہوئی۔

۲۔ مستقل بالذات احکام وہدایات کی شرح ووضاحت، خواہ وہ قرآن میں ہوں یا قرآن سے باہر۔

۳۔ اِن احکام وہدایات پر عمل کا نمونہ۔...

ہمارے علما ان تینوں کے لیے ایک ہی لفظ ''سنت'' استعمال کرتے ہیں۔ میں اِسے موزوں نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک پہلی چیز کے لیے ''سنت''، دوسری کے لیے ''تفہیم وتبیین'' اور تیسری کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ اصل اور فرع کو ایک ہی عنوان کے تحت اور ایک ہی درجے میں رکھ دینے سے جو خلط مبحث پیدا ہوتا ہے، اُسے دور کر دیا جائے۔" (مقامات ۱۶۱-۱۶۲)

"پانچواں اصول یہ ہے کہ وہ چیزیں جو محض بیان فطرت کے طور پر آئی ہیں، وہ بھی سنت نہیں ہیں، اِلّا یہ کہ انبیا علیہم السلام نے اُن میں سے کسی چیز کو اٹھا کر دین کا لازمی جز بنا دیا ہو۔... انسان ہمیشہ سے جانتا ہے کہ نہ شیر

۱۔ البقرہ ۲: ۱۵۸۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اور چیتے اور ہاتھی کوئی کھانے کی چیز ہیں اور نہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔اِس طرح کی بعض دوسری چیزیں بھی روایتوں میں بیان ہوئی ہیں،اُنھیں بھی اِسی ذیل میں سمجھنا چاہیے اور سنت سے الگ انسانی فطرت میں اُن کی اِسی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے۔''(میزان ۶۱)

اس اصول کی تفہیم کے لیے انسانی فطرت اور فطری رہنمائی سے متعلق ان اصولی توضیحات کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو مصنف نے کتاب میں دیگر مقامات پر بیان کی ہیں۔

''مبادی تدبر قرآن'' کے تحت ''دین کی آخری کتاب'' کے زیر عنوان مصنف نے بیان کیا ہے کہ قرآن مجید نے اپنی دعوت کسی ایسے ماحول میں پیش نہیں کی جو کسی بھی قسم کے مذہبی یا تاریخی پس منظر سے مجرد ہو، بلکہ تین طرح کے مقدمات کو بنیاد بناتے ہوئے پیش کی ہے۔اس ضمن میں مصنف نے فطرت کے حقائق،دین ابراہیمی کی روایت اور نبیوں کے صحائف کا ذکر کیا ہے۔ فطرت سے مراد ایمان واخلاق کے بنیادی حقائق ہیں جنھیں قرآن مجید میں 'معروف' اور 'منکر' سے تعبیر کیا گیا ہے،یعنی ''وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت ابا کرتی اور اُنھیں برا سمجھتی ہے''(میزان ۴۶)۔یہ حقائق کون سے ہیں اور انھیں کس طرح انسانی فطرت کا حصہ بنایا گیا ہے ؟اس کی تفصیل مصنف نے ''اخلاقیات'' کے باب میں بیان کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو ظاہری حواس کے علاوہ ایک حاسۂ اخلاقی بھی عطا کیا گیا ہے جو خیر وشر کے امتیاز میں انسان کی مدد کرتا ہے اور ''یہ احساس انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اُس کے دل ودماغ میں الہام کر دیا گیا ہے۔''(میزان ۲۰۲)۔ مصنف کے نقطۂ نظر سے، انبیا کے ذریعے سے انسانوں کو دی جانے والی ہدایت اسی فطری الہام کی بنیاد پر انھیں مخاطب بناتی ہے اور اس الہام کی تعبیر میں انسانوں کے مابین جو اختلافات پیدا ہو سکتے تھے یا عملاً ہوئے،ان میں بھی خدا کے فیصلے کو واضح کرتی ہے۔

زیر بحث اصول میں مصنف نے فطری الہام اور منزل ہدایت کے باہمی تعلق کی ایک خاص جہت کو واضح کیا ہے۔اس کا حاصل یہ ہے کہ ہدایت الٰہی کے جو پہلو انسانوں پر اپنی فطرت کی رو سے ہی ہمیشہ سے واضح تھے اور بنی نوع انسان اللہ کی طرف سے عطا کی گئی فطری ہدایت کی روشنی میں عمومی طور پر ان کو ملحوظ رکھتے چلے آرہے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دی جانے والی شریعت میں ان کے ساتھ دو طرح کا معاملہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے احکام، مثلاً جسمانی طہارت ونجاست سے متعلق ہدایات کو تو باقاعدہ شریعت کا حصہ بنا کر انھیں بطور دین امت میں جاری کر دیا گیا ہے، جب کہ بہت سے دیگر احکام کو ان کی اصل فطری حیثیت میں ہی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

رکھتے ہوئے ان کی تصویب کی گئی ہے اور دینی نصوص میں اسی حیثیت سے ان کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ خورونوش کے باب میں جن چیزوں کا ذکر مصنف نے کیا ہے، وہ ان کے نقطۂ نظر سے یہی نوعیت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ باقاعدہ دینی احکام کے طور پر امت میں جاری نہیں کیے گئے، بلکہ ہمیشہ سے معلوم و معروف فطری پابندیوں کے طور پر ہی ان کو برقرار رکھا گیا ہے، اس لیے مصنف کی اصطلاح کے مطابق انھیں سنت میں شمار نہیں کیا جائے گا۔

”چھٹا اصول یہ ہے کہ وہ چیزیں بھی سنت نہیں ہو سکتیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے اُنھیں بتائی تو ہیں، لیکن اِس رہنمائی کی نوعیت ہی پوری قطعیت کے ساتھ واضح کر دیتی ہے کہ اُنھیں سنت کے طور پر جاری کرنا آپ کے پیش نظر ہی نہیں ہے۔“ (میزان ۶۱)

یہ اصول سنت کی اصطلاح کو امت کے اجتماعی عمل میں جاری کردہ احکام و شرائع تک محدود رکھنے کی وضاحت کرتا ہے۔ مصنف کے نقطۂ نظر سے اصل اور بنیادی دین وہی ہے جس کا مکلف علی العموم پوری امت کو ٹھیرایا گیا ہے اور عمومی تبلیغ و تعلیم کے ذریعے سے اس کو بھی یقینی بنایا گیا ہے کہ وہ احکام تاریخی سطح پر امت کے مجموعی علم اور عمل میں محفوظ رہیں۔ اس خاص زاویۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انفرادی سطح پر مختلف لوگوں کو جو دینی اعمال واذکار سکھائے، لیکن انھیں اجتماعی عمل میں جاری کردہ دینی روایت کا حصہ نہیں بنایا، انھیں سنت سے الگ اور ممتاز رکھا جائے تاکہ درجہ بندی، اہمیت واہتمام اور تاریخی ثبوت کے لحاظ سے ان میں جو فرق پایا جاتا ہے، وہ واضح رہے۔ اس نکتے کی وضاحت میں کچھ مزید مدد چوتھے اور ساتویں اصول سے بھی ملتی ہے۔

”ساتواں اصول یہ ہے کہ جس طرح قرآن خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتا، اِسی طرح سنت بھی اِس سے ثابت نہیں ہوتی۔... قرآن ہی کی طرح سنت کا ماخذ بھی امت کا اجماع ہے اور وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے امت کو ملا ہے، اِسی طرح یہ اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے۔“ (میزان ۶۲)

اس شرط کی عقلی بنیاد مصنف نے بہت وضاحت سے بیان کر دی ہے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ اسی طرح کی شرط ہے، جیسی فقہا واصولیین کا ایک گروہ اور خاص طور پر فقہاے احناف عموم بلویٰ کی نوعیت رکھنے والے شرعی احکام کے ثبوت کے لیے عائد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عموم بلویٰ کی نوعیت رکھنے والے امور میں خبر واحد سے شریعت کا کوئی واجب اور لازم حکم اخذ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ دین کے ایسے احکام سے متعلق جن کا جاننا اور جن کی پابندی کرنا لوگوں پر عمومی طور پر واجب ہے، یہ ضروری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کا ابلاغ

بھی اسی درجے میں، پورے اہتمام کے ساتھ فرمائیں اور آپ کے بعد آپ کی امت انھیں اسی طرح شہرت و استفاضہ کے ساتھ نسلاً بعد نسل نقل کرتی رہے۔ دوسرے لفظوں میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی احکام وہدایات کی اشاعت اور ان کی تبلیغ و تعلیم کا اہتمام کرتے ہوئے دین میں ان کی اہمیت اور حیثیت کو ملحوظ رکھا ہے اور کسی ایسے بنیادی اور اصولی حکم کے ابلاغ کو اخبار آحاد پر منحصر نہیں چھوڑا جس کا جاننا یا اس پر عمل کرنا عمومی طور پر امت پر لازم ہو۔ نتیجتاً احناف کے نزدیک اخبار آحاد سے وہی احکام اخذ کیے جا سکتے ہیں جن کا تعلق دین کے فروع اور جزئیات سے ہو اور جن کا جاننا یا ان پر عمل کرنا ساری امت پر لازم نہ ہو (جصاص، احکام القرآن ۱/۲۰۲-۲۰۳۔ سرخسی، اصول السرخسی ۱/۳۷۸)۔

مصنف نے بھی سنت کے تاریخی ثبوت کے سوال میں اس نکتے کو بنیادی اہمیت دی ہے اور یہ امتیاز قائم کیا ہے کہ اگر کسی حکم کو امت کے عمومی تعامل کا حصہ بنایا جانا یا، بہ الفاظ دیگر، ''بطور سنت جاری کرنا'' مقصود ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر لازم تھا کہ اس حکم کا ابلاغ پوری قطعیت کے ساتھ کریں اور وہ تواتر کے ساتھ امت میں نسل در نسل منتقل ہو۔ سنت کی نوعیت، مصنف کی اصطلاح کے مطابق، چونکہ یہی ہے، اس لیے جس چیز کا ثبوت اخبار آحاد پر منحصر ہو، وہ سنت نہیں ہو سکتی۔ البتہ اسوۂ حسنہ اور تفہیم و تبیین کی نوعیت رکھنے والے امور کے ابلاغ میں چونکہ اس نوعیت کا اہتمام مطلوب نہیں تھا، اس لیے ان کے ثبوت کے لیے تواتر کی شرط عائد کرنے کی بھی ضرورت نہیں اور ان کا ماخذ اخبار آحاد کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عرفان شہزاد

ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی: دینی اور سماجی تناظر میں متعلقہ مسائل کا جائزہ اور تجاویز

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

["نقطۂ نظر" کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

رضامندی سے ہم جنس پرستی، جنسی زیادتی اور جنسی زیادتی کے بعد قتل —— ہم جنس پرستی سے متعلق یہ تین صورتیں ملک میں گذشتہ کچھ برسوں میں رپورٹ ہونے والے واقعات کے تناظر میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی ہیں۔ ایسے حالیہ واقعات کے نمایاں ہو کر سامنے آنے کی دو وجوہات ہیں: آبادی میں اضافہ اور سوشل میڈیا کا پھیلاؤ۔ آبادی میں بڑھوتری کے ساتھ ایسے واقعات کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر معلوم واقعہ کا سوشل میڈیا پر چرچا ہونا اسے زبان زد عام کر دیتا ہے جس سے ان کے کثرت وقوع کا تاثر مزید مضبوط ہوتا ہے۔ تاہم آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی شرح کم و بیش وہی ہے جو سماج میں ہمیشہ سے رہی ہے۔ سوشل میڈیا کے اس دور سے پہلے ایسے واقعات کی رپورٹنگ محدود تھی اور آبادی کم ہونے کی وجہ سے ان کی تعداد بھی کم تھی، اس لیے سماج میں کوئی موثر ارتعاش برپا کرنے کے بجائے یہ اپنے دائرے میں ہی معدوم ہو جایا کرتے تھے۔ تاہم اب ان واقعات کے خلاف سماج کی بڑھتی حساسیت سماجی سطح پر ایک اہم

پیش رفت ہے، جس سے متعلقہ قانونی، سماجی اور ذہنی ڈھانچے میں بہتری لانے میں مدد مل سکتی ہے۔

ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی سے متعلق یہ واقعات سماج کے مختلف طبقوں کی طرف سے سامنے آئے ہیں۔ جنسی زیادتی کے بعد قتل کے جرم کے علاوہ، مدارس دینیہ کا حصہ اس معاملے میں تناسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہے، جب کہ جنسی زیادتی کے بعد قتل کے واقعات زیادہ تر مدارس کے باہر کے جارحین کی طرف سے صادر ہوئے ہیں۔

اس مسئلے کا درست تجزیہ کرنے کے لیے چند اصولی باتیں باور کرنا ضروری ہے، اس کے ساتھ اپنے سماج کے حقیقت پسندانہ تجزیے کو بھی گوارا کر لیا جائے تو ان مسائل کے ممکنہ قانونی اور سماجی حل میں یقیناً مدد مل سکتی ہے۔

اس مسئلے کے تین فریق ہیں: بچے، والدین اور فاعل (بچے کے ساتھ جنسی عمل کرنے والا)، جس کی ایک صورت اس کا جارح (زیادتی کرنے والا) ہونا بھی ہے۔

ہم جنس پرستی کے ایسے واقعات کیوں ہوتے ہیں؟ اس مضمون میں اس مسئلے کا دینی اور سماجی پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ جارح کو زیادتی کا موقع کیسے ملتا ہے، اس تناظر میں والدین اور تعلیم گاہوں، خصوصاً مدارس —— جہاں یہ واقعات تسلسل سے پیش آتے ہیں —— کے کردار پر بحث کی گئی ہے۔ اس مضمون میں ہم ان جرائم کی پیدایش کے مذہبی، سماجی،، معاشی اور قانونی ذرائع اور منابع کو نمایاں کریں گے اور اس کے ساتھ ان کی روک تھام کی تجاویز پیش کریں گے۔

جنسی زیادتی کے بعد قتل کی وارداتوں میں اضافہ یقیناً تشویش ناک ہے، لیکن یہ اس جرم کی انتہائی صورت ہے۔ جنسی زیادتی کے اصل جرم کے حجم کے مقابلے میں یہ Tip of Iceberg ہے۔ یہ پکتے ہوئے لاوے کی سطحی پھنکار ہے۔ اصل جرم کیفیت کے اعتبار سے اگرچہ کم شدید، مگر حجم کے اعتبار سے کئی گنا زیادہ ہے۔ قتل کا خون تو پکار اٹھتا ہے، مگر آہوں اور سسکیوں کی آوازیں کم ہی سنائی دیتی ہیں۔ آنسو جب تک خون بن کر آنکھوں سے بہ نہیں پڑتے، دکھائی نہیں دیتے۔ آہ جب تک کسی مردہ جسم میں سرد نہ ہو جائے، سنائی نہیں دیتی۔

چند اصولی باتیں

معاملے کی درست تفہیم کے لیے چند اصولی باتیں طے کرنا ضروری ہیں:

پہلی بات یہ کہ طاقت ور اور کم زور کے تعامل میں جہاں کہیں قانون غیر موجود یا غیر موثر ہو گا اور کم زور کی حمایت میں سماجی دباؤ کم ہو گا، طاقت ور، کم زور کا استحصال کرنا چاہے گا۔ کسی ذاتی اخلاقی قوت کے علاوہ کوئی چیز

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس سے مانع نہیں ہو سکتی، اور یہ اخلاقی قوت عملاً کم ہی موثر ہو پاتی ہے۔ زیر بحث معاملہ میں کم زور فریق کم سن بچہ ہے، جو اپنے سے طاقت ور افراد (استاد، ہم سبق / ہم مکتب، قریبی رشتہ دار، محلے دار وغیرہ) کی حراست میں آجاتا ہے اور استحصال سے مراد جنسی زیادتی ہے۔

دوسرے یہ کہ طویل یا معتد بہ اوقات کے لیے کم سن بچوں کا متعلقہ طاقت ور اور بااختیار افراد کو دستیاب ہونا انھیں بچوں کے استحصال پر ابھارتا ہے۔ جسمانی تشدد اور جنسی زیادتی کے واقعات کا تناسب وہاں زیادہ ہو گا جہاں یہ امکانات زیادہ ہوں گے۔

اپنے فطری اور حقیقی نگہبانوں (والدین) کی عدم نگرانی میں دستیاب کم سن بچے، کسی قریبی رشتہ یا محلے دار کو دستیاب ہو جائیں یا بڑی عمر کے ہم سبق، ہم مکتب لڑکوں یا بااختیار استاد کو، انھیں استحصال کرنے کا میدان میسر آجاتا ہے۔ اس اصول کے تحت دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ امکانات گھر یا محلے میں ٹیوشن کے دوران میں ایک محدود وقت کے لیے میسر ہیں، اسی وجہ سے یہاں پیش آنے والے واقعات کا تناسب بھی نسبتاً کم ہے۔ یہاں ایسے حادثات کی روک تھام آسان بھی ہے۔ کم سن بچوں کو اول تو ٹیوشن کی ضرورت نہیں۔ اسکول کے بعد انھیں پڑھانا کسی وجہ سے ضروری ہو تو گھر میں اور ٹیوشن سنٹر میں تدریس کی جگہ ایسی ہونی چاہیے کہ مختلف اطراف سے نظر رکھی جا سکے۔ چونکہ یہاں تعلیم کا معاوضہ دیا جاتا ہے، اس لیے ایک ممکنہ فاعل اور جارح مالی نقصان سے بچنے کے لیے بھی ایسی کسی حرکت سے بچنے کو ترجیح دیتا ہے۔

بچے سے زیادتی سے متعلق مذکورہ بالا امکانات سب سے زیادہ مدارس کے ماحول میں میسر ہیں، یعنی قانون اور جواب دہی کے نظام کا کم موثر یا غیر موثر اور سماجی دباؤ کم ہونا، بچے کا طویل اوقات کے لیے مدارس میں موجود ہونا۔ چنانچہ یہاں اس جرم کے وقوع کا تناسب دوسری جگہوں کے مقابلے میں زیادہ ہونا تعجب انگیز نہیں ہے۔

کم سن بچے اسکولوں میں بھی طویل اوقات کے لیے موجود ہوتے ہیں، مگر وہاں اس قسم کے واقعات کا پیش آنا تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں اور وہ یہ کہ یہاں کاروباری نفسیات کارفرما ہے۔ تعلیم کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ بچے گویا گاہک ہوتے ہیں، جنھیں خوش اور راضی رکھنا اسکول انتظامیہ کی ترجیح ہوتی ہے۔ جنسی زیادتی تو در کنار کوئی اور حادثہ بھی پیش آجائے تو اسکول کی شہرت داؤ پر لگ سکتی ہے، ان کا کاروبار متاثر ہو سکتا ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر بچوں سے جنسی زیادتی کے مواقع اور امکانات پیدا نہیں ہونے دیے جاتے: کم سن بچوں کو پڑھانے کے لیے عموماً خواتین اساتذہ رکھی جاتی ہیں، ہم سن بچوں کے کمرہ ہاے جماعت الگ الگ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہوتے ہیں، اس عمر کے بچوں کے اسکول رہایشی نہیں ہوتے۔ اسکولوں میں تنہائی (privacy) کے مواقع کم یاب ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس، مدارس کاروباری نفسیات سے آزاد ہوتے ہیں۔ عطیات اور چندے کے پیسوں سے مدارس کے اخراجات چلائے جاتے ہیں۔ تعلیم مفت ہے۔ مفت میں دی چیز احسان مندی کا تقاضا کرتی ہے اور احسان مند کا استحصال کرنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ یہاں بچے کو خوش اور راضی رکھنا مجبوری یا ترجیح نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہاں تشدد سے لے کر ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی کے قبل از وقوع روک تھام پر کوئی موثر توجہ نہیں ہوتی۔ مدارس میں اس بات کا کوئی خاص اہتمام نہیں ہوتا اور نہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ مختلف عمروں کے بچوں کو الگ الگ جماعتوں میں بانٹ کر پڑھایا جائے۔ مدارس کا بجٹ اس کی اجازت نہیں دیتا۔ چھوٹے بڑے، سب بچے ایک چھت کے نیچے ایک ہی ہال میں قرآن حفظ کرتے ہیں۔ ان کی مختلف ٹکڑیوں میں بھی مختلف عمروں کے بچے ملے جلے ہوتے ہیں۔ یوں بڑے لڑکوں کی چھوٹے بچوں تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ استاد مرد ہوتے ہیں، اور مدرسے کے اندر اساتذہ کے حجرے ہوتے ہیں جہاں بغیر اجازت آنا منع ہوتا ہے۔ معیاری اسکولوں میں کیمرے نصب ہوتے ہیں، جب کہ مدارس میں یہ رجحان اب تک نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ اس کی مخالفت بھی کی جاتی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن مجید کا استاد ہونے کی بنا پر مدرسہ اور قاری صاحب کے ساتھ جڑے تقدس اور احترام کے رشتے استاد کو زیادہ بااختیار بنا دیتے ہیں۔ استاد کی شکایت کرنے پر خود بچے کو ہی بے ادب قرار دے دیے جانے کا رجحان مضبوط ہے۔ بچے پر تشدد کے معاملے میں استاد کو مطلق اختیار والدین کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ یہاں ظالم و مظلوم کا رشتہ سماجی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اختیار کا یہی استعمال جنسی زیادتی کے لیے مد ہو جاتا ہے۔

جہاں تک مدارس میں ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی کے بارے میں فاعل کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کا تعلق ہے، تو جب تک پکا ثبوت ہاتھ نہ آئے یا معاملہ مدرسے کی بدنامی کو پہنچ نہ جائے، مدارس کی انتظامیہ عموماً اس معاملے میں صرف نظر سے کام لینا پسند کرتے ہیں۔ کسی فاعل کے خلاف کارروائی ہو بھی تو خود احتسابی کے اندرونی نظام کے تحت ہوتی ہے۔ پولیس کو شامل نہیں کیا جاتا تاکہ مدرسے کی بدنامی نہ ہو۔ اس طرح فاعل کی سماجی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسے مدرسے، مسجد سے نکال بھی دیا جائے تو وہ کسی دوسرے مدرسے یا مسجد میں بہ آسانی شمولیت اختیار کر کے اپنے رجحان کی تسکین کے مواقع تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے۔ فاعل کی جنسی بے راہ روی کی تشہیر نہ کرنا عیوب پر پردہ ڈالنے کے دینی مثبت تصور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس طالب علم

یا استاد کی جڑیں اور تعلقات زیادہ مضبوط ہوں، اس کے خلاف بولنا یا کارروائی کرنا عموماً احاطۂ امکان سے باہر رہتا ہے۔ فاعل اگر مہتمم ہو تو اسے مستقل مامونیت حاصل ہوتی ہے۔ ایسے رجحانات فاعل اور جارح کے لیے حوصلہ افزا ہوتے ہیں۔

یہاں دو سوال قابل غور ہیں

پہلا یہ کہ بچوں سے جنسی تعلق اور زیادتی کرنے پر مائل ہونے کے عوامل کیا ہیں؟

دوسرا یہ کہ مدارس میں کم سن بچوں کو داخل کرانے کے رجحان کی وجوہات کیا ہیں؟ یہ داخلہ والدین کی رضامندی، بلکہ ان کی خواہش پر ہوتا ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس رضامندی اور خواہش کے پیدا کرنے کے محرکات کیا ہیں جو والدین کو اپنے بچوں کے لیے یہ خطرات مول لینے پر مجبور کرتے ہیں؟ یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ مدارس کی طرف سے جنسی زیادتی کے واقعات تسلسل سے رپورٹ ہونے کے باوجود کم سن بچوں کے مدارس میں نئے داخلوں میں کوئی محسوس کمی آئی ہے اور نہ پہلے سے موجود بچو ں کو نکال لیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے دو عوامل ہیں: دینی اور سماجی۔

پہلے ہم دوسرے سوال کی طرف متوجہ ہوں گے کہ کم سن بچوں کو مدارس میں داخل کرانے کا رجحان اتنا مضبوط کیوں ہے؟

دینی عامل

مذہبی طبقات کی طرف سے مسلم سماج کو ایک طویل عرصے سے مسلسل یہ باور کرایا گیا ہے کہ حفظ قرآن ایک بہت بڑی سعادت ہے، جس کے حصول کے لیے بہترین عمر بچپن کی ہے؛ گھرانے کا ایک حافظ بچہ پورے خاندان کو، جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی، جنت میں لے جانے کا سبب بنے گا[1]، حافظ کے والدین کو قیامت کے

۱۔ 'لِحامِلِ القرآنِ إذا عمِلَ بِهِ ، فأَحَلَّ حلالَهُ ، وحرَّمَ حرامَهُ ، يشفَعُ فِي عشرَةٍ مِنْ أهلِ بيتِهِ يومَ القيامَةِ ، كلُّهم قدْ وجبَتْ لَهُ النارُ'، ''وہ حافظ قرآن جو اس کی حلال کردہ اشیا کو حلال اور حرام کردہ اشیا کو حرام کرتا ہے، وہ اپنے گھرانے کے دس افراد، جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی، سفارش کرے گا'' (شعب الایمان ۲/۱۰۳۸)۔ اسے علامہ البانی نے ضعیف قرار دیا ہے (ضعیف الجامع، رقم ۴۶۶۲)۔

اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت بھی ضعیف ہے:

روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ ہو گی[۲]، وغیرہ۔ یہ اور اس قسم کی دیگر ضعیف روایات کے ذریعے سے والدین کے دینی جذبات کو انگیخت کیا جاتا ہے۔ جہنم کی آگ کا خطرہ دنیا کے کسی بھی خطرے کے مقابلے میں کم ہوتا ہے، اس لیے والدین ہر خطرہ مول لے کر بچے کو حفظ کرانے پر تُل جاتے ہیں۔ جہنم سے تحفظ اور جنت کی طلب کی یہ خواہش اس قدر شدید ہوتی ہے کہ حفظ کے لیے کم سن بچوں کو اپنے گاؤں، محلے اور شہر سے دور کے مدرسے میں داخل کرانا بہتر سمجھا جاتا ہے۔اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے علاقے کے مدرسے میں بچے کی توجہ اپنے گھر، والدین، بہن بھائیوں، رشتہ داروں اور کزنز و مقامی دوستوں، وغیرہ کی یاد اور ملن کی تڑپ میں بھٹکتی ہے،اس لیے بچے کو ان تمام رشتوں ناتوں سے دور کسی باہر کے مدرسے میں بھیجا جائے، جہاں وہ کوئی شناسانہ پائے اور یوں مختلف عمر اور مختلف علاقوں کے لڑکوں اور اساتذہ کے اجنبی ماحول میں وہ پوری توجہ سے قرآن مجید حفظ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یوں بچے کا بچپن تو تباہ ہو ہی جاتا ہے،اس کی معصومیت بھی ہمہ وقت خطرے میں رہتی ہے۔ بچہ جتنا کم عمر اور خوش شکل ہوتا ہے، اس کے استحصال کے امکانات اتنے زیادہ ہوتے ہیں۔

والدین کی آخرت سے متعلق یہ لالچ اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ حفظ قرآن کی اس غیر واجب رسم کے لیے وہ بچے پر نہ صرف خود تشدد کرتے ہیں، بلکہ اساتذہ کو بھی اس کی کھلی اجازت دیتے ہیں۔ اس پر یہ بے بنیاد روایت بھی مشہور کر رکھی ہے کہ جسم کے جس حصے پر استاد کی مار پڑے گی،اس پر جہنم کی آگ حرام ہے۔ یہ معاملہ یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ تشدد کی صورت میں بچہ اگر شدید زخمی ہو جائے یا اس کی موت واقع ہو جائے تو والدین استاد

مَن قرأَ القرآنَ واستَظهرَهُ فأحلَّ حلالَهُ وحرَّمَ حَرامَهُ أدخلَهُ اللهُ بِهِ الجنَّةَ وشفَّعَهُ في عَشرةٍ من أهلِ بَيتِهِ كلُّهُم قَد وجبَت لَهُ النَّارُ. (ترمذی، رقم ۲۹۰۵)

”جس نے قرآن پڑھا، اسے حفظ کیا، اس کی حلال کردہ اشیا کو حلال اور حرام کردہ اشیا کو حرام کرتا ہے، وہ اپنے گھرانے کے دس افراد، جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی، سفارش کرے گا۔“

امام ترمذی اس کی سند کو صحیح نہیں بتاتے۔ علامہ البانی نے اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے (ضعیف الترمذی، رقم ۲۹۰۵)۔ سند کے ضعف سے قطع نظر، یہاں جس حامل قرآن اور قرآن پڑھنے کا ذکر ہے، وہ بے سمجھے نہیں ہے اور نہ ہی یہاں قرآن کے زبانی یاد کر لینے کا کوئی مفہوم واضح طور پر پایا جاتا ہے۔

۲۔ مشکاۃ المصابیح ۱/ ۶۶۰۔ علامہ البانی نے اس روایت کو ضعیف بتایا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کو معاف کر دیتے ہیں، کیونکہ ان کے مطابق بچہ خدا کی راہ میں شہید ہوا ہے اور والدین کے لیے جنت میں داخلے اور جہنم سے دفاع کی جس ضمانت کے لیے اسے برسوں محنت کرنا تھی، وہ سفر جلد طے ہو گیا، بچہ ان کے لیے آخرت کا ذخیرہ بن گیا۔ استاد کی ''خدمت'' کے لیے استاد کو سزا کیوں دی جائے۔ قانون اور سزا سے یہ بے خوفی تشدد پر آمادہ طبائع کی کتنی حوصلہ افزائی کرتی ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اختیار کی یہ بے قیدی اور سزا سے کم خوفی بچے کے جنسی استحصال کی طرف مائل طبائع کے لیے بہت حوصلہ افزا ہے۔

جہاں بچوں کے بارے میں والدین کی حساسیت کا یہ عالم ہو، وہاں بچے کے لیے جنسی زیادتی کا خطرہ جانتے بوجھتے مول لینا والدین کے لیے کم اہم ہو جاتا ہے۔ راقم کو ایسے والدین دیکھنے کا موقع ملا جن کے بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی ہوئی، انھیں خبر کی گئی اور وہ بچے کو تسلی دے کر پھر اسی مدرسے میں ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ بہت ہوا تو ایسے ہی کسی دوسرے مدرسے میں اسے داخل کرا دیا، مگر حفظ مکمل کرائے بنا وہ اسے واپس لے جانے پر تیار نہ ہوئے۔

سماجی عوامل

اس میں درج ذیل عوامل شامل ہیں:

غربت

گھرانے کی کم آمدنی اور مفلسی بچوں کو مدارس میں داخل کرانے کی ایک بڑی وجہ ہے۔ مدارس میں طلبہ کو رہایش، کھانا اور کپڑے وغیرہ مفت ملتے ہیں۔ دوسرا فائدہ دینی تعلیم کا ہوتا ہے۔ امکان ہوتا ہے کہ مفت پرورش کے ساتھ بچہ اگر حافظ، قاری اور عالم بھی بن جائے تو نہ صرف سماج میں عزت ملتی ہے، بلکہ امکان ہوتا کہ وہ برسر روزگار بھی ہو جائے گا۔ کسی مدرسے یا مسجد میں ملازمت مل جائے گی یا اپنا مدرسہ یا مسجد کھول سکتا ہے۔ لیکن بچہ اگر کچھ بھی نہ بن پائے تو اسے اس وقت تک مدرسے میں پھر بھی رکھوایا جاتا ہے، جب تک وہ کمائی کرکے والدین کا سہارا بننے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ جب وہ اس قابل ہو جاتا ہے تو اسے مدرسے سے اٹھوا کر کام پر ڈال دیا جاتا ہے۔

کثیر العیال ہونا

کثیر العیال ہونا نہ صرف مذہبی طور پر مستحسن سمجھا جاتا ہے، بلکہ سماجی لحاظ سے ایسا گھرانا ایک طاقت ور گھرانا سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے دیہی اور قبائلی ماحول میں اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے۔ قانون کی بالادستی سے محروم

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سماج میں کثیر العیال ہونا ذاتی تحفظ کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کثیر العیال والدین دینی اور سماجی، دونوں لحاظ سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اپنے ایک یا ایک سے زائد بچوں کو مدرسے میں داخل کرا کر سماجی اور اخروی عزت و وقار حاصل کریں۔ کثیر العیال والدین اگر کم آمدنی کے حامل ہوں تو مدرسہ میں داخلہ ان کی ترجیح ہی نہیں، مجبوری بھی بن جاتی ہے۔

کثیر العیال والدین کی اپنے بچوں سے عموماً اتنی گہری جذباتی وابستگی نہیں ہوتی جو شہروں کے ماحول میں کم بچوں والے گھرانوں کے والدین میں دیکھی جاتی ہے۔ اس وجہ سے بھی بچوں کے جذبات، ان کی شکایات اور ان کو کم سنی میں پیش آنے والے خطرات کے بارے میں وہ غیر حساس یا کم حساس ہوتے ہیں۔ مدارس میں یہ کئی کئی ماہ اپنے بچوں کی خبر نہیں لیتے۔ بعض بچوں کی تو اپنے والدین سے سال میں ایک یا دو بار ہی ملاقات ہو پاتی ہے۔ والدین اور بچوں کے درمیان باہمی گفتگو کا خلا اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ بچے کا والدین سے اپنے ساتھ بیتی کسی زیادتی کا ذکر کرنا بھی مشکل، بلکہ اکثر ناممکن ہوتا ہے۔ ایسے تقریباً لاوارث قسم کے بچے جنسی زیادتی کے شوقین فاعلین اور جارحین کے لیے تر نوالہ ہوتے ہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بچوں کی طرف جنسی میلان کی وجوہات

اب پہلے سوال کہ بچوں سے جنسی تعلق اور زیادتی کرنے پر مائل ہونے کے کیا عوامل اور وجوہات ہیں، پر بات کی جاتی ہے:

ایک المیہ یہ ہے کہ مدارس میں طلبہ کو جن چیزوں یا اقدار کے لیے حساس بنایا جاتا ہے، ان میں بچوں کے ساتھ جنسی افعال کرنے کے خلاف حساسیت پیدا کرنا شامل نہیں ہے۔ یہاں زور حساس بنانے پر ہے۔ کسی مسئلے کی محض آگاہی دینا یا مذمت کرنا الگ چیز ہے اور اس کے بارے میں حساس بنانا الگ بات ہے۔ اہل مدارس ناموس رسالت، ناموس صحابہ، مسلکی شناخت ظاہر کرنے والی علامات اور مذہبی سیاسی نظریات کے بارے میں شدید حساس ہوتے ہیں، ان کے بارے میں وہ سر مو انحراف برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتے، یہاں تک کہ اس معاملے میں تشدد پر بھی اتر آتے ہیں، لیکن ہم جنس پرستی کے خلاف صرف یہ کہ ان میں حساسیت نہیں پائی جاتی، بلکہ اس بارے میں ان کا رویہ دفاعی، بلکہ جارحانہ حد تک دفاعی ہوتا ہے۔ مدارس سے متعلق ایسی خبروں اور واقعات کو قالین کے نیچے دبانے، مدارس و مساجد سے وابستہ ایسے ملزمان کا دفاع کرنے، انھیں قانون کی پکڑ سے بچانے اور ان کی حیثیت عرفی کی بحالی میں مصروف رہتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ دوسرے فرقے کے

اہل مذہب کے خلاف یہ الزامات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس بارے میں ایک خاموش اتحاد ہے جو مختلف مسالک اور فرقوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

جنسی خواہش پوری کرنے کے لیے بچوں کی طرف متوجہ ہونا کسی نام نہاد جین کی وجہ سے ہو یا نہ ہو، سماج میں پائے جانے والے رجحان کے زیر اثر، البتہ ضرور ہوتا ہے۔ جن سماجوں میں عورت سماج سے غائب ہے، گھروں میں محدود ہے، اور ان سے تعامل کے مناسب اور جائز ذرائع بھی مفقود ہیں، نکاح و شادی کے علاوہ مرد و عورت کے کسی بھی قسم کے تعلق پر سماج شدید رد عمل دکھاتا ہے، سماجی مقاطعہ سے لے کر کاروکاری، اور غیرت کے نام پر قتل کرنا معمول کی بات ہے، وہاں جنسی داعیات ہم جنس پرستی کے کم خطرناک مصرف کی طرف مائل کر دیتے ہیں کہ ''جب راہ نہیں پاتے تو چڑھ جاتے ہیں نالے''۔ چنانچہ ہمارے ملک کے وہ علاقے جہاں عورت کو پردے کے نام پر سماج سے غائب رکھا گیا ہے، ہم جنس پرستی میں زیادہ بری شہرت کے حامل ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جہاں تک مدارس کا تعلق ہے، تو یہاں بھی عورت سرے سے غائب ہوتی ہے، بلکہ عورت کو دیکھنے، اس کے بارے میں گفتگو کرنے، حتیٰ کہ اس کو سوچنے پر بھی گناہ گاری کے احساس کو بڑی شدت سے اجاگر کیا جاتا ہے۔ ادھر ہر عمر کے لڑکوں کے ساتھ تعامل کے ان گنت مواقع میسر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جنسی داعیات ہم جنس پرستی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ جہاں کہیں مقصد برآری سہولت سے ممکن نہ ہو، وہاں جبر بھی در آتا ہے اور انتہائی صورت میں معاملہ جنسی زیادتی کے ساتھ قتل کرنے تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ مدارس میں اس کام کی کھلی چھٹی ہے، پکڑے جانے پر سخت سزا اور سرزنش کی جاتی ہے، لیکن اس معاملہ میں حد درجہ کم حساس ہونے کی بنا پر وہ ایسے اقدامات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جو ایسے واقعات کی روک تھام ممکن بنا سکیں۔

مدارس میں بچہ جہاں والدین کی نگرانی سے دور اجنبی لوگوں کے درمیان رہتا ہے، اس کے لیے استاد کی خوش نودی حاصل کرنے اور ہم مکتب بڑے لڑکوں کی دھمکیوں (bullying) کے خوف سے نجات حاصل کرنے کا یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ ان کی بات مان لے اور کسی کو شکایت بھی نہ کرے۔ ایک بار عادی ہو جانے کے بعد اس کا پلٹنا مشکل بھی ہو جاتا ہے۔ بڑا ہو کر وہ خود بھی شکاری بنتا ہے، یوں ایک تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ زیادتی کے بعد بچوں کے قتل کرنے کے پیچھے ایک محرک اس فعل کا قانونی سزا کے زمرے میں آجانا ہے۔ قانون کی پکڑ کے ڈر سے بچوں کو قتل کیا جاتا ہے۔

ہم جنس پرستی سماج کی طرح مدارس میں بھی ایک ہنسی مزاح کا موضوع ہے، ایسے قصوں اور کہانیوں کو

مزے سے بیان کیا جاتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی طبقے نے اس معاملے میں مذہب کے بیانیے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ قرآن مجید میں قوم لوط کا قصہ بے سمجھ تلاوت تک محدود ہے، حتیٰ کہ روزانہ جہری نمازوں میں قوم لوط کے عمل اور ان کے عبرت ناک انجام سے متعلق قرآن کی آیات کی تلاوت کا معمول بھی کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔

اس بارے میں کم حساسیت کا ایک نمونہ مدارس کے متعلقہ مذہبی بورڈز کا مدارس میں پیش آنے والے جنسی زیادتی کے مسلسل واقعات پر خاموشی کا رویہ ہے۔ وہ مسئلے کی سنگینی کو تسلیم اور اعتراف کرنے پر بھی تیار نہیں، چہ جائیکہ وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اس کے برعکس، ایک بورڈ نے اپنے ایک ہم مسلک مدرسے کے طلبہ کے سالانہ نتائج اس بنا پر روک لیے تھے کہ مدرسے سے وابستہ کچھ شخصیات کے نظریات اور رجحانات ان کے مطابق ان کے مسلک سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ اس غیر قانونی حرکت پر جب قانونی چارہ جوئی کا عندیہ دیا گیا تو نتائج جاری کیے گئے، مگر آج تک ان کی طرف سے کسی مدرسے سے رپورٹ ہونے والے کسی انتہائی واقعہ میں بھی کہ جس میں بچے قتل بھی ہوئے، کوئی رد عمل نہیں دیا گیا۔ ہم جنس پرستی کی یہ خاموش حمایت عادی اور ممکنہ فاعلین اور جارحین کے لیے حوصلہ افزا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہم جنس پرستی ایک تہذیبی قدر

ایک سماجی حقیقت یہ ہے کہ ہم جنس پرستی دنیا کی قدیم اور جدید تہذیبوں کی طرح انڈو پاک تہذیب کی بھی ایک منفی تہذیبی قدر رہی ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے دبستانوں کی شاعری تو اس سے بھری ہوئی ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی برات'' میں بڑے فخر کے ساتھ اپنی اس ''خوش ذوقی'' کے ثبوت کے طور پر اپنے اور دوستوں کے ہم جنس پرستی کے قصوں کو بیان کیا ہے۔ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی وغیرہ نے اپنے افسانوں میں اس مسئلے کو موضوع بنایا ہے۔

میر تقی میر کو، معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خاص دل چسپی رہی تھی۔ کہتے ہیں:

چشمک کرے ہے میری طرف کو نگاہ کر
وہ طفل شوخ چشم قیامت شریر ہے

ہجر میں اس طفل بازی کوش کے رہتا ہوں جب
جا کے لڑکوں میں ٹک اپنے دل کو بہلاتا ہوں میں

ترک بچے سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا میں نے کہے
رفتہ رفتہ ہندستاں سے شعر مرا ایران گیا

وزیر علی صبا لکھنوی لڑکے کے چہرے پر جوانی میں بال، یعنی روآں، جسے خط آنا کہتے ہیں، آنے سے اس کے حسن میں کمی آنے پر کہتے ہیں:

پیشتر خط سے مزا تھا حسن کا اے نونہال
ہو گیا داغی ترا سیب زنخداں آج کل

حیدر علی آتش کہتے ہیں:

امرد پرست ہے تو گلستاں کی سیر کر
ہر نونہال رشک ہے یاں خورد سال کا

مصحفی غلام ہمدانی کہتے ہیں:

لالے کی شاخ ہر گز لہکے نہ پھر چمن میں
گر سر پہ سرخ چیرا وہ نونہال باندھے

فراق اور درد کے شاگرد میر محمدی بیدار کہتے ہیں:

آخر اس طفل شوخ نے دیکھا
ٹکڑے جوں شیشہ کر دیا دل کو

تمیز الدین تمیز دہلوی لکھتے ہیں:

فربہ تھا توانا تھا تیرا جانا مانا تھا
جس پہ تو ہوا شیدا لونڈا ہے قصائی کا

اسی طرح خوب صورت لڑکوں سے تعلق رکھنا اس قماش کے لوگوں کے لیے فخر کا باعث ہوتا ہے۔

یہ حوالے محض افراد کے نہیں، سماج میں پائی جانے والی ایک روایت کے ہیں، جس کا اظہار کچھ افراد کے قلم سے ہوا ہے۔ اور یہ مسئلہ صرف لکھنؤ اور دہلی کی تہذیب کا نہیں ہے، ہمارے سماج کی تمام مقامی زبانوں میں اس رجحان کی طرف اشارے کرتے لطیفے، محاورے، ضرب الامثال، کنائے، اور گالیاں بھی ایسے ہی اظہاریے ہیں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں یہ رجحان نہ صرف وافر طور پر موجود رہا ہے، بلکہ یہ بھی کہ اسے کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر زیر لب معنی خیز تبسم میں کرنا، اسے مزاح کی صورت میں بیان کرنا، یہ بتاتا ہے کہ سماج نے اس رجحان کے ساتھ ایک خاموش سمجھوتا کر رکھا ہے۔ تاہم اپنے بچوں کے ساتھ ایسا ہونا کسی کو گوارا بھی نہیں۔ ہم جنس پرستی کی شہرت رکھنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

شہری اور غیر شہری تہذیبوں کا ایک فرق

یہاں ایک فرق کو نمایاں کرنا ضروری ہے۔ ہماری تہذیب میں ہم جنس پرستی کا موجود ہونا اور اسے ایک حد میں گوارا کرنے کا رجحان شہری علاقوں کی تبدیل ہوتی ثقافت سے اک ذرا مختلف چیز ہے۔ جنسی زیادتی کے بارے میں جو حساسیت شہری مزاج میں اب پائی جاتی ہے، وہ ہماری روایتی اقدار کے حامل غیر شہری سماج میں اتنی نہیں پائی جاتی۔ اس ماحول میں ایسا واقعہ پیش آنا غیر متوقع نہیں۔ کچھ یہی وجہ رہی ہے کہ شہری مدارس کے ماحول میں ایسے واقعات پیش آنے پر متاثرہ بچے کے والدین کے ردعمل کی کم حساسیت کا مشاہدہ، جو راقم کو بارہا ہوا، ایک صدمہ کی بات ہے۔ جیسا کہ پیش تر کہا گیا، یہ والدین اپنے متاثرہ بچے کو تسلی دے کر پھر وہیں چھوڑ آتے یا ایسے ہی کسی دوسرے مدرسے میں ڈال دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے شہری ماحول میں پلے بڑھے افراد کے حالات اس سے بالکل مختلف ہیں، جہاں بچوں کی تعداد کم ہوتی ہے، جذباتی وابستگی زیادہ ہوتی ہے اور انھیں والدین کی مسلسل نگرانی میں پروان چڑھایا جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حفظ قرآن کی حقیقت

ہدایت اور رہنمائی کے لیے قرآن مجید کا مسلمانوں کی زبانوں پر جاری رہنا، ان کی نمازوں میں اس کی تلاوت کی ضرورت کے لحاظ سے اس کا جتنا حصہ ان کو یاد ہو، یہ سعادت کی بات ہے۔ تاہم پورے قرآن مجید کا زبانی یاد کرنا واجب عمل نہیں ہے اور کسی غیر واجب کام کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں قرآن مجید کو زبانی یاد کرنے کی شروعات اس وجہ سے ہوئی تھی کہ عرب کے ماحول میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ قرآن مجید کی حفاظت، تلاوت اور اس کی تعلیم و ترسیل کے لیے اسے زبانی یاد کر لینے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ تاہم اس کی حیثیت ایک انتظامی بندوبست کی تھی۔ قرآن مجید اس دور میں بھی کتابت کے ذرائع کی کمی کے باوجود وحی کی حفاظت اور ترسیل کے لیے کتابت کے ذریعے ہی کو اہمیت دیتا اور اس کے لیے قلم کا ذکر کرتا ہے:

اِقۡرَاۡ وَرَبُّکَ الۡاَکۡرَمُ. الَّذِیۡ عَلَّمَ　　”اِنھیں پڑھ کر سناؤ، اور حقیقت یہ ہے کہ

بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ.
(العلق ۹۶: ۳-۵)

تمھارا پروردگار بڑا ہی کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے یہ قرآن سکھایا۔ انسان کو اِس میں وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔''

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ.
(القلم ۶۸: ۱)

''یہ سورۂ نون ہے۔ قلم گواہی دیتا ہے اور جو کچھ (لکھنے والے اُس سے) لکھ رہے ہیں، (یعنی وحی)۔''

عرب کے لوگ قرآن مجید کو بلا سمجھے یاد نہیں کرتے تھے، ایسا کرنا ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا، اس لیے کہ وہ قرآن کی زبان سے واقف تھے۔ چنانچہ جب انھیں قرآن پڑھنے یا یاد کرنے کا کہا گیا، اس سے بے سمجھے تلاوت یا یاد کروانا مراد لینے کی کوئی گنجایش ہرگز نہیں نکلتی، مگر جب عجمی اقوام دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں تو یہ پہلی بار ان کے ہاں ہوا کہ بے سمجھے تلاوت اور حفظ کو انھوں نے اس تلاوت اور حفظ کے مترادف سمجھ لیا جس کی ترغیب دی گئی تھی۔ امام ابو بکر طرطوشی لکھتے ہیں:

ومما ابتدعه الناس فی القرآن، الاقتصار علی حفظ حروفه دون التفقُّه فيه. (الحوادث والبدع ۱۰۱)

''قرآن مجید کے متعلق لوگوں کی ایک بدعت قرآن کے فہم و تفقہ کو چھوڑ کر محض اس کے الفاظ کو حفظ کرنے پر اکتفا کر لینا ہے۔''

اس کے برعکس، احادیث میں ''قرآن کا قاری'' اور ''صاحب قرآن'' اس شخص کو کہا گیا ہے جو قرآن پر عمل کرے، اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھے، تبھی وہ ان بشارتوں اور فضیلتوں کا مستحق ہے جو ان احادیث میں بتائی گئیں، یہ شخص قرآن کو سمجھنے والا عالم ہی ہو سکتا ہے۔ اس سے ہمارے ہاں کا مروجہ عجمی حافظ مراد لینا کسی طرح بھی درست نہیں، جو بلا سمجھے قرآن کو زبانی یاد کرتا ہے اور نہ ہی قرآن کو سمجھنے کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ مثلاً:

يقال لصاحب القرآن: اقرأ وارتق ورتل كما كنت ترتل في الدنيا فإن منزلك عند آخر آية تقرؤها[۳].

''صاحب قرآن کو کہا جائے گا کہ جس طرح تم دنیا میں ترتیل کے ساتھ قرآن مجید پڑھتے تھے، آج بھی پڑھتے جاؤ؛ جہاں تم آخری آیت

۳۔ مسند احمد، رقم ۶۷۹۹۔ سلسلہ صحیحہ ۵/ ۲۸۱۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پڑھو گے، وہی تمھاری منزل ہو گی۔''

'صاحب قرآن' سے مراد قرآن کا فہم رکھنے والا مراد ہونا لازم ہے، عرب کے جس ماحول میں یہ ارشاد فرمایا گیا، وہاں قرآن کو نہ سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن بعد کے ادوار میں 'صاحب قرآن' سے ہمارے مروجہ حافظ کے معنی میں لینے اور قرآن پڑھنے سے زبانی پڑھنے کو سمجھ لیا گیا ہے، حالاں کہ صاحب قرآن ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جسے قرآن فہمی اور قرآن کی تعلیمات سے اشتغال تو بہت ہو، لیکن وہ قرآن کا حافظ نہ ہو۔

قرآن کے فہم سے یہ لازماً مراد نہیں ہے کہ سمجھنے والا فنی اور اعلیٰ علمی سطح سے بھی واقف ہو۔ یہ سطح ظاہر ہے کہ اہل فن کا کام ہے۔ قرآن فہمی کے درجے ہیں اور ہر درجہ کی قدر خدا کے ہاں ہونا متوقع ہے۔

حافظ بچہ جنت کا ٹکٹ نہیں ہے کہ خدا کے عدل کے قانون کو توڑ کر ایسے افراد کو بھی جہنم سے بچا لے جائے جن پر ان کے اعمال کے سبب جہنم واجب ہو چکی ہو۔ ایسا بیان کرنے والی روایات ضعیف اور دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہیں[4]۔ قرآن ہر شخص کو اس کے اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھیراتا ہے[5]، کوئی کسی دوسرے کا ضامن بن سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کا بوجھ ہی اٹھا سکتا ہے[6]، اور نہ کسی کی سفارش میرٹ کے بغیر کر سکتا

۴۔ 'حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَمْرِو بْنِ السَّرْحِ، أَخْبَرَنَا ابْنُ وَهْبٍ، أَخْبَرَنِي يَحْيَى بْنُ أَيُّوبَ، عَنْ زَبَّانِ بْنِ فَائِدٍ، عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ الْجُهَنِيِّ، عَنْ أَبِيهِ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ''مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ وَعَمِلَ بِمَا فِيهِ، أُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ضَوْءُهُ أَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِي بُيُوتِ الدُّنْيَا لَوْ كَانَتْ فِيكُمْ، فَمَا ظَنُّكُمْ بِالَّذِي عَمِلَ بِهَذَا''؟'، ''معاذ جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن پڑھا اور اس کی تعلیمات پر عمل کیا تو اس کے والدین کو قیامت کے روز ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک سورج کی اس روشنی سے بھی زیادہ ہو گی جو تمھارے گھروں میں ہوتی ہے اگر وہ تمھارے درمیان ہوتا، (پھر جب اس کے ماں باپ کا یہ درجہ ہے) تو خیال کرو خود اس شخص کا جس نے قرآن پر عمل کیا، کیا درجہ ہو گا'' (مشکاۃ المصابیح، رقم ۲۱۴۰)۔ علامہ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ 'كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ'، ''ہر متنفس (اُس روز) اپنی کمائی کے بدلے رہن ہو گا'' (المدثر ۷۴: ۳۸)۔

۶۔ 'وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ'، ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اور اگر کوئی بوجھ سے دبا ہوا اپنا بوجھ

ہے"۔ عوام کے یہ تصورات درست کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے بچوں کے کاندھے پر بیٹھ کر جنت کی آسان راہ تلاش کرنے کی جہالت سے چھٹکارا پا سکیں۔

قرآن مجید کے محفوظ ہو جانے کے ذرائع جواب میسر ہیں، اس کے بعد قرآن کی حفاظت کے لیے اسے زبانی یاد کرنے کی وہ اہمیت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ تاہم اب بھی کوئی حفظ کرنا چاہے تو یہ ذوقی اور شعوری معاملہ ہونا چاہیے، جو ظاہر ہے کہ شعور کی عمر کو پہنچ کر فرد کو کرنا چاہیے۔ جسے حفظ کا شوق ہوا ہو، وہ خود حفظ کرے، بچوں پر اپنی خواہش کا بوجھ ڈالنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ہم قرآن مجید کو بے سمجھے پڑھنے کی ممانعت قرآن و حدیث میں پاتے ہیں۔ قرآن مجید مسلسل زور دیتا ہے کہ

بٹانے کے لیے پکارے گا تو اُس میں سے کچھ بھی بٹایا نہ جائے گا، چاہے (جس کو پکارا جائے)، وہ قرابت مند ہی کیوں نہ ہو۔ (یہ نہیں سنتے تو اِنھیں اب اِن کے حال پر چھوڑو، اے پیغمبر)۔ تم صرف اُنھی کو خبردار کر سکتے ہو جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز کا اہتمام کرتے رہے ہیں۔ (یہ پاکیزگی کی دعوت ہے) اور جو پاکیزگی حاصل کرتا ہے، وہ اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے اور (ایک دن) پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے" (فاطر ۳۵: ۱۸)۔

۷۔ "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ"، "ایمان والو، (تم اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑو اور) جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے، اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) اُس دن کے آنے سے پہلے خرچ کر لو، جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی، نہ (کسی کی) دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی سفارش نفع دے گی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُس دن کے منکر ہی اپنی جان پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ (اُس دن معاملہ صرف اللہ سے ہو گا)۔ اللہ، جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، زندہ اور سب کو قائم رکھنے والا۔ نہ اُس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے حضور میں کسی کی سفارش کرے۔ لوگوں کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز سے واقف ہے اور وہ اُس کے علم میں سے کسی چیز کو بھی اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے، مگر جتنا وہ چاہے۔ اُس کی بادشاہی زمین اور آسمانوں پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی حفاظت اُس پر ذرا بھی گراں نہیں ہوتی، اور وہ بلند ہے، بڑی عظمت والا ہے" (البقرہ ۲: ۲۵۴-۲۵۵)۔

اس پر غور و تدبر کیا جائے اور تدبر نہ کرنے والوں کی وہ مذمت کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح حدیث ہے:

لَمْ يَفْقَهْ مَنْ قَرَأَ الْقُرْآنَ فِي أَقَلَّ مِنْ ثَلَاثٍ[8].

''اس نے قرآن سمجھا ہی نہیں جس نے تین دن سے کم مدت میں قرآن ختم کر ڈالا۔''

جس بے سمجھ تلاوت کی اس حدیث میں شکایت کی گئی ہے، وہ ہر اس تلاوت پر صادق آتی ہے جس میں پڑھنے والے کا سمجھنے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس روایت کی بنا پر قرآن مجید کو تین دن سے کم میں ختم نہ کرنے کی طرح توڑالی گئی، مگر روایت کا مقصود، یعنی بے سمجھ تلاوت کی مذمت کو باور نہیں کیا گیا اور تین دن کے بجائے تمام عمر بے سمجھ تلاوت اور حفظ کو بھی باعث اجر سمجھ لیا گیا۔

اس مفہوم کی حدیث سے بے سمجھ تلاوت و حفظ کے جواز پر استدلال سوء فہم ہے، جس میں ا-ل-م کی تلاوت پر تیس نیکیوں کی ضمانت دی گئی ہے[9]۔ یہ طرز تکلم تشویق پیدا کرنے کے لیے ہے، نہ کہ بے سمجھ تلاوت کی ترغیب دینے کے لیے۔ ا-ل-م کو بطور مثال ثواب کا حجم بتانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ بات کسی طرح درست قرار نہیں دی جاسکتی کہ قرآن جس کا مقصد ابلاغ معنی ہے، اسے بے سمجھ پڑھنے کی ترغیب دی جائے اور وہ بھی ان لوگوں کو جن کے لیے قرآن کی زبان سے واقفیت کی بنا پر اسے بے سمجھے پڑھنا ممکن ہی نہ تھا۔

اولاد پیدا کرنے میں منصوبہ بندی

دینی لحاظ سے شادی کے بعد اولاد پیدا کرنا دین کا حکم نہیں۔ اولاد پیدا کرنے کی کوشش کرنا انسان کا اپنا آزاد اور سمجھ دارانہ فیصلہ ہونا چاہیے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ اس عورت سے شادی کرو جو زیادہ پیار کرنے والی ہو اور یہ کہ میں قیامت کے دن دوسرے انبیا پر تمھاری کثرت پر فخر کروں گا[10]، دراصل محض

۸۔ امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے (ترمذی، رقم ۲۹۴۹)۔ علامہ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے (مشکاۃ المصابیح، رقم ۲۲۰۱)

۹۔ 'مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ، وَالحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا، لَا أَقُولُ الم حَرْفٌ، وَلَكِنْ أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيمٌ حَرْفٌ' (ترمذی، رقم ۲۹۱۰)۔ امام ترمذی نے اسے حسن صحیح غریب قرار دیا ہے۔ علامہ البانی نے اسے صحیح بتایا ہے۔

۱۰۔ 'تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ، إِنِّي مُكَاثِرٌ الْأَنْبِيَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ'۔ مسند احمد الرسالۃ (۶۳/۲۰) اس روایت کی

زیادہ بچے پیدا کرنے کے لیے نہیں، بلکہ قابل فخر بچے پیدا کرنے کے لیے ہے، اور قابل فخر بچے پیدا کرنے کے لیے اتنے ہی بچے پیدا کیے جائیں جن کی اچھی پرورش اور تعلیم و تربیت کی جاسکتی ہو، اور یہ سب والدین کی نگرانی سے دور ممکن نہیں۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات کو آپ کے دور میں مسلمانوں کو درپیش حالات کے تناظر میں ایک انتظامی ضرورت کے تناظر میں دیکھنا درست ہو گا۔ حکومتیں اپنے ملک کے معاشی حالات کے تقاضوں سے اپنے لوگوں کو کم بچے پیدا کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، اسی طرح حالات اگر تقاضا کریں تو آبادی بڑھانے کی ترغیب بھی دے سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سربراہ ریاست بھی تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی مختصر سی تعداد اپنے سے کئی گنا زیادہ بڑے دشمنوں سے برسرپیکار تھی۔ ادھر مال غنیمت اور خراج کا مال بھی مدینہ آنے لگا تھا جس سے معاشی حالات بہتر ہو رہے تھے۔ مستقبل میں روم وایران سے جنگیں ہونے کی پیشین گوئیاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے تھے۔ ان حالات میں اگر آپ نے آبادی بڑھانے کی ترغیب میں درج بالا ارشاد فرمایا تھا تو یہ قرین قیاس ہے، لیکن اسے ہر گھر اور ہر سماج کے حالات کے علی الرغم ایک مطلق اصول کے طور پر تسلیم کرانا درست نہ ہو گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مروجہ تصور کے برعکس قرآن مجید اولاد اور کھیتی کا تقابل کر کے اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اولاد کو کھیتی کی طرح ہی پیدا کرنے سے پہلے وہ تمام منصوبہ بندی کر لینی چاہیے جو ایک کسان فصل اگانے سے پہلے اور اس کے دوران میں کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ. ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ.(الواقعہ ۵۶:۵۸-۵۹)

’’پھر کبھی سوچا ہے، یہ نطفہ جو تم ٹپکاتے ہو، اُس سے جو کچھ بنتا ہے، اُسے تم بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں؟‘‘

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ. ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ.(الواقعہ ۵۶:۶۳-۶۴)

’’پھر تم نے کبھی سوچا ہے، یہ جو کچھ تم بوتے ہو، اِسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں؟‘‘

دونوں عمل ایک ہی اصول پر مبنی ہیں کہ کوشش انسان کرتا ہے، باقی سب خدا کی قدرت کا ہاتھ کرتا ہے۔ لیکن کیا اس بھروسے پر انسان بے سوچے سمجھے، اور بے ڈھب طریقے سے فصلیں اگاتا ہے؟ ایسا اگر وہ کرے تو

سند قوی مانی گئی ہے۔

کیا نتائج نکلیں گے؟ اگر یہاں وہ ایسا نہیں کرتا تو یہ ناانصافی شعور اور احساس رکھنے والے انسان کے بچوں کے پیدا کرنے کے ساتھ کیوں کر روا رکھی جا سکتی ہے؟ چنانچہ انسان کو دنیا میں لانے کا فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے وسائل، استطاعت، تربیت، اور بچوں کو دینے کے لیے وقت وغیرہ کے تمام لوازمات کا لحاظ کر لینا نہایت ضروری ہے۔

خدا کی رزاقیت کا تصور

خدا کی رزاقیت کے تصور کو بھی درست کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی خدا کی ایسی کوئی ذمہ داری بیان نہیں ہوئی کہ وہ سب کو روزی پہنچائے گا۔ قرآن کے مطابق جو روزی جان داروں کو ملتی ہے، وہ خدا نے مہیا کر رکھی ہے، نہ یہ کہ وہ سب کو روزی دے گا[11]۔ ایسا نہ قرآن کا دعویٰ ہے اور نہ ہی حقیقت میں ایسا ہوتا ہے۔ روزی ملنا محنت اور قسمت کے پیچیدہ تعامل پر مبنی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ قرآن کی جس آیت سے خدا کی بغیر شرائط کی رزاقیت کے بھروسے پر اولاد پیدا کرنے کا استدلال کیا جاتا ہے، وہی آیت اس کی نفی کر رہی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡيَةَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۱)	”تم لوگ اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم اُنھیں بھی روزی دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔ اُن کا قتل یقیناً بہت بڑا جرم ہے۔“

غور طلب یہ ہے کہ یہ ارشاد کن لوگوں کے لیے ہے کہ تمھاری اولاد کو بھی روزی ملے گی، جیسے تمھیں ملتی ہے۔ یہ ان کو کہا جا رہا ہے جن کو اتنی روزی بھی نہیں ملتی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو کھلا سکیں اور اس قدر وہ مجبور ہو گئے تھے کہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو قتل کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ تو اس آیت سے یہ استدلال کس طرح درست ہو سکتا ہے کہ بچے اس بھروسے پر پیدا کرتے چلے جائیں کہ ان کے رزق کا ذمہ خدا پر ہے، وہ انھیں ضرور پہنچائے گا۔ اس کے برعکس یہاں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ بچے بغیر کسی منصوبہ بندی کے پیدا ہو ہی گئے ہیں تو انھیں خود قتل کر کے ایک اور بڑا جرم نہ کرو۔ جیسی کچھ روزی تمھیں ملتی ہے، انھیں بھی مل سکتی ہے۔ یہ بھی

۱۱۔ ’وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا وَيَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَمُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ‘، ”زمین پر چلنے والا کوئی جان دار نہیں ہے، جس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔ اور وہ اُس کے ٹھکانے کو بھی جانتا ہے اور اُس جگہ کو بھی جہاں وہ (مرنے کے بعد زمین کے) سپرد کیا جائے گا۔ یہ سب ایک کھلی کتاب میں درج ہے“ (ہود ۱۱: ۶)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ممکن ہے کہ اس سے بہتر مل جائے اور یہ بھی نہ ملے۔ بھوک اور مفلسی کے ہاتھوں انھیں مرنا ہے تو یہ فیصلہ قدرت پر چھوڑ دو، خود یہ کام کرنے کا جرم نہ کرو۔

تجاویز

۱۔ بچوں کو جنسی حملوں سے بچانے میں سب سے اہم کردار والدین کا ہے۔ انھیں یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ وہ اپنے کم سن بچے کو کسی ایسی جگہ بھیجنے پر کبھی تیار نہ ہوں جہاں وہ ان کی نگرانی اور خبر داری سے دور ہو۔

۲۔ اپنے وسائل سے زیادہ بچے پیدا کرنے کے رجحان کی دینی حیثیت واضح کرنے پر زور دینا چاہیے کہ ایسا کرنا دین کا حکم نہیں ہے۔

۳۔ سماجی تحفظ کے لیے کثیر العیال ہونے کے رجحان کی نفی اس کے بنا ممکن نہیں کہ حکومت قانون کی بالادستی کو یقینی بنائے تاکہ تحفظ اور انصاف کا حصول زور بازو نہیں، بلکہ قانون کی پاس داری کے بل بوتے پر ممکن ہو سکے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۴۔ حکومت کو درج ذیل امور میں قانون سازی کرنے کی اشد ضرورت ہے، جس کے لیے حقیقی عزم کی ضرورت ہے۔

۵۔ کم سن بچوں کے مدارس میں رہایش کے لیے داخلے پر مکمل پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ مدارس دینی تعلیم کا تخصیصی ادارہ ہیں۔ تخصیصی تعلیم میں کسی بچے کا رجحان جانے بغیر اس کا داخلہ بچے کا استحصال ہے۔ کم از کم بارہ سال کی وسیع البنیاد تعلیم ہر بچے کا حق ہے۔ اس کے بعد یہ فیصلہ اسے کرنے کا حق ہے کہ اس نے حافظ، قاری، عالم بننا ہے یا ڈاکٹر، انجینئر، اکاؤنٹنٹ یا بینکار بننا ہے۔ حکومت اس کے لیے قانون سازی کرے کہ کوئی بچہ کسی متخصص تعلیم کے کسی ادارے میں بارہ برس کی وسیع البنیاد تعلیم کے بنا داخلہ نہیں لے سکتا۔

۶۔ اسکولوں کی طرز پر تمام مدارس کی رجسٹریشن کو یقینی بنایا جائے، جس میں رجسٹریشن کے شرائط میں عمارت اور دیگر لوازمات کا تعلیمی نقطۂ نظر سے قابل قبول ہونا یقینی بنایا جائے۔ ان شرائط پر پورا نہ اترنے والے مدارس کی رجسٹریشن اگر پہلے ہو چکی ہے تو منسوخ کر دی جائے اور اس منسوخی کو موثر طور پر مشتہر کرنے کا اہتمام کیا جائے تاکہ لوگ اپنے بچے وہاں داخل نہ کرائیں۔ ایک جامع کارروائی کرکے ان مدارس کی تالا بندی کی جائے جو بلا اجازت مدرسہ چلا رہے ہیں۔

۷۔ مدارس سے ملنے والی شکایت کی صورت میں مدارس پر جرمانہ یا رجسٹریشن منسوخی پر عمل درآمد یقینی بنایا جائے۔

۸۔ مدارس کے وفاق کو قومی تعلیمی بورڈ میں ضم کیا جائے۔ اگر یہ فی الحال ممکن نہ ہو تو بورڈ کے اراکین میں ملک کے معتبر افراد کی معتد بہ تعداد کو شامل کیا جائے تاکہ وہاں سماج کی آواز موثر ہو سکے۔

۹۔ مدارس کے فضلا کو ہنر مندی سکھائی جائے تاکہ ان میں سے جو چاہیں اپنے لیے آمدن کے متبادل ذرائع پیدا کر سکیں اور یوں سماج پر غیر ضروری بوجھ بننے کے بجاے معاشی سرگرمیوں کا مفید حصہ بن سکیں۔

۱۰۔ جنسی زیادتی سے متعلق معاملات کی رپورٹ کرنے کے لیے عوام کو ترغیب دی جائے۔ بدنامی کے خوف سے اپنے متاثرہ بچے کو خاموش کرانا اور خود بھی چپ رہنا فاعل اور جارح کی حوصلہ افزائی کا سبب ہے۔

۱۱۔ کم سن بچوں کو اچھے اور برے مَس (good and bad touch) اور بڑوں کے پیار کے انداز میں کسی بے ہودگی کو سمجھنے کی ترغیب دی جائے۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ اپنے یا کسی دوسرے کے ساتھ بیتے ایسے کسی حادثے یا اس کے ابتدائی مقدمات کی بلا جھجک اطلاع اپنے والدین اور قابل بھروسا بڑوں کو دیں۔ اس سلسلے میں والدین کی تربیت کے لیے ورک شاپس کرائی جائیں کہ بچوں کے ساتھ ایسے معاملات کی آگاہی کیسے دینی چاہیے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۲۔ مدارس میں داخلے اور مساجد میں تقرری کے لیے فرد کے کردار کی سند کو لازمی بنایا جائے۔ کسی جرم کی صورت میں کردار کی سند جاری کرنے والے ادارے کو ذمہ داری میں شامل کیا جائے۔

۱۳۔ ہم جنس پرستی اور جنسی زیادتی سے متعلق قرآن مجید کی متعلقہ آیات کو نصاب میں ثانوی اور میٹرک کے نصابات میں شامل کیا جائے۔

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت علی رضی اللہ عنہ

(۱۸)

["سیر و سوانح" کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت علی کی علمی آرا

حضرت علی قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ جملہ دینی علوم کا دریا تھے۔ کلام الٰہی سے خاص شغف تھا۔ کسی آیت کا کوئی پہلو نظر سے مخفی نہ تھا۔ نزولی ترتیب پر مشتمل قرآن مجید کا ایک نسخہ ان سے منسوب ہے (فہرست ابن ندیم ۳۰)۔

مصحف قرآنی کی زیادہ تر کتابت حضرت ابی بن کعب اور حضرت زید بن ثابت نے کی، حضرت علی بھی کاتبین وحی میں شامل تھے، یہ فریضہ انجام دینے والے دیگر اصحاب حضرت عثمان بن عفان، حضرت خالد بن سعید، حضرت ابان بن سعید، حضرت علا بن حضرمی، حضرت معاویہ اور حضرت حنظلہ اسیدی ہیں۔

حضرت علی کو سماع حدیث کا خوب موقع ملا۔ ان سے مروی احادیث کی تعداد پانچ سو چھیاسی ہے۔ فرماتے ہیں: جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ارشاد سنتا ہوں تو اللہ اس سے جو نفع پہنچانا چاہتا ہے، پہنچاتا ہے۔ اور جب میں آپ کے کسی صحابی سے حدیث سنتا ہوں تو اس سے حلف لیتا ہوں، وہ حلف اٹھا لے تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں (ابوداؤد، رقم ۱۵۲۱۔ ابن ماجہ، رقم ۱۳۹۵۔ احمد، رقم ۲)۔

کہا جاتا ہے کہ ابوالاسود دوئلی (ظالم بن عمرو) نے علم نحو حضرت علی سے سیکھا۔انھوں ہی نے اس کو بتایا، کلام کی تین قسمیں ہیں: اسم، فعل اور حرف۔ وہ جنگ جمل میں ان کے ساتھ تھا۔

ابن کوا نے حضرت علی سے پوچھا: امیر المومنین، یہ چاند میں داغ کیسا ہے؟انھوں نے جواب دیا: یہ ایک نشانی تھی جو مٹادی گئی ہے۔ کیا تو قرآن نہیں پڑھتا، اللہ نے فرمایا ہے: 'وَجَعَلۡنَا الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيۡنِ فَمَحَوۡنَآ اٰيَةَ الَّيۡلِ وَجَعَلۡنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبۡصِرَةً'، ''اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا، پھر رات کی نشانی کو مٹا دیا اور دن کی نشانی کو روشن رکھا'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۲)۔ یہ وہی محو (مٹانا) ہے، (یعنی محو کے اطلاقات میں سے ایک ہے)۔

حضرت علی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: آپ نے فرمایا ہے کہ خنس سورج اور چاند کے ساتھ چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خنس کی قسم کھائی ہے۔ بتائیں کہ خنس ہے کیا؟ آپ نے فرمایا: علی، یہ برجیس، زحل، عطارد، بہرام اور زہرہ پانچ ستارے ہیں جو سورج اور چاند کی طرح گردش میں رہتے ہیں۔

حضرت علی کہتے ہیں: آدم علیہ السلام کو ہندوستان کے علاقے سرندیپ (سری لنکا) میں واقع نوذ نامی پہاڑ پر اتارا گیا، جب کہ حوا جدہ میں اتریں۔ مزید فرماتے ہیں: دنیا کی سب سے اچھی آب و ہوا والی سرزمین ہندوستان ہے جہاں آدم علیہ السلام کو اتارا گیا۔

حضرت علی کہتے ہیں: ہابیل و قابیل، آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے تھے۔ جب ہابیل قابیل کے ہاتھوں قتل ہو گئے تو حضرت آدم نے یہ اشعار پڑھے:

تغيرت البلاد ومن عليها
فوجه الأرض مغبرّ قبيح

''زمین اور اس پر آباد دنیا بدل گئی ہے۔ روے زمین غبار آلودہ اور بدنما ہو گیا ہے۔''

تغير كل ذي طعم و لون
وقل بشاشة الوجه المليح

''ہر ذائقے والی اور رنگ دار شے متغیر ہو گئی ہے، خوب صورت چہرے کی مسکراہٹ جاتی رہی ہے۔''

حضرت علی نے ایک یہودی کو ایک مسلمان سے بحث کرتے دیکھا تو کہا: اسے چھوڑو اور جو پوچھنا ہے، مجھ سے پوچھو۔ اس نے کہا: آپ تو بڑے عالم ہیں۔ فرمایا: کسی عالم سے پوچھو گے تو زیادہ فائدہ ہو گا۔ سعید بن مسیب

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کہتے ہیں: علی کے علاوہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھ سے پوچھو۔

حضرت علی کے عہد خلافت پر ایک نظر

کچھ کمیاں

حضرت علی کا پورا عہد خانہ جنگی اور اندرونی جھگڑوں میں بسر ہوا، اس لیے کوئی تعمیری کام ہوا، نہ سیستان اور کابل کے سوا بیرونی فتوحات کا سلسلہ جاری رہ سکا۔ عہد رسالت سے قرب کی وجہ سے خلافت صدیقی میں اسلامی روح زندہ تھی۔ حضرت ابو بکر صحابہ کے مشورے سے امور سلطنت انجام دیتے تھے، غیر عرب عنصر کا کوئی دخل نہ تھا۔ حضرت عمر کے دور خلافت میں یہی صورت حال برقرار تھی، اس لیے نظام حکومت میں کوئی خلل نہ آیا، البتہ حضرت عثمان کے زمانے میں حالات بدلنے لگے۔ کئی اکابر صحابہ دنیا سے اٹھ گئے اور نئی پود سامنے آگئی۔ اموی نوجوان نظام حکومت کو خلافت راشدہ کی شاہ راہ سے ہٹانے کے درپے ہو گئے۔ حضرت علی کے دور میں عجمی اثرات کا نفوذ بڑھنے لگا۔ نو مسلم عجمیوں کو حضرت علی کیا، اسلام سے بھی کوئی ہم دردی نہ تھی۔ وہ محبت اہل بیت کی آڑ میں مسلمانوں سے اپنی قومی تباہی کا انتقام لینا چاہتے تھے، دیر سے اسلام قبول کرنے والے کئی عرب بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ حضرت ابو بکر کا مقابلہ مرتدین، مدعیان نبوت اور منکرین زکوٰۃ سے تھا، مسلمانوں کا بچہ بچہ ان کے ساتھ متحد تھا، جب کہ حضرت علی کو حضرت معاویہ اور ام المومنین حضرت عائشہ کا سامنا تھا۔ اہل ایمان اس باب میں متردد ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اصحاب رسول تقسیم ہو کر باہم برسرپیکار ہو گئے۔

حضرت علی میں حضرت ابو بکر جیسا تحمل تھا، نہ حضرت عمر جیسا دبدبہ۔ وہ مصلحت اندیشی کو بالکل راہ نہ دیتے تھے۔ جس تقویٰ اور عدل کے ساتھ وہ حکمرانی کرنا چاہتے تھے، لوگ اسے برداشت کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے۔ حضرت علی بیت المال کا ایک حبہ بھی بے جا صرف نہ ہونے دیتے تھے۔ کوڑی کوڑی کا حساب لینے کی وجہ سے ان کے اعزہ بھی ان سے کبیدہ خاطر ہو گئے تھے، جب کہ آپ کے حریف حضرت معاویہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے خزانے کا منہ کھول دیتے تھے۔ ان کی داد و دہش مخالفین تک کا منہ بند کر دیتی تھی۔

حضرت علی کے کئی فیصلے سیاسی اعتبار سے غلط ثابت ہوئے۔ انھوں نے حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس کا مشورہ رد کرتے ہوئے حضرت معاویہ کو معزول کیا اور پھر کچھ نوجوانوں کے کہے میں آکر مدبر گورنر مصر حضرت قیس بن سعد کو ہٹا دیا۔

عہد مرتضوی کی ایک بڑی کم زوری یہ تھی کہ حضرت علی کے کئی اصحاب اور جرنیل کوتاہ ہمت تھے۔ انھیں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اپنے ساتھ چلانے کے لیے حضرت علی کو بہت زور لگانا پڑتا تھا۔ ایک بار انھوں نے بددعا دی: اللہ، جس طرح ان لوگوں نے میرے ساتھ خیانت و بے وفائی کی توان پر بنو ثقیف کا ایک ظالم نوجوان مسلط کر دے جو ان کا سبزہ چر جائے، ان کی پوشاکیں چھین لے اور ان میں جاہلی فرمان جاری کرے۔ حسن بصری کہتے ہیں: آج کل حجاج یہی کچھ کر رہا ہے۔

حضرت علی نے مدینہ منورہ کی جگہ کوفہ کو دار الخلافہ بنایا تو حضرت عبداللہ بن عمر نے اعتراض کیا تو فرمایا: وہاں مال اور آدمی ہیں۔

حضرت علی کی کامیابیاں

حضرت علی نے نظام خلافت کا احیا کرنے اور شیخین ابو بکر و عمر کا دور زندہ کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے حضرت عمر کے جاری کردہ نظم و نسق کو ممکن حد تک بحال کیا۔ نجران کے عیسائیوں نے دوبارہ حجاز میں بسنے کی درخواست کی تو فرمایا: عمر سے زیادہ صائب الرائے کون ہو سکتا ہے؟ انھوں نے حضرت عمر کی طرح اہل حرفہ (کاریگروں) پر ٹیکس عائد کیا۔ حضرت علی نے مجاہدین کے نومولودوں کے لیے حضرت عمر کے جاری کردہ وظائف کو برقرار رکھا۔ ابن حزم کہتے ہیں: حضرت علی نے خلفائے ثلاثہ، حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کے کسی حکم کو تبدیل کیا، نہ ان کے معاہدوں کو باطل قرار دیا (الفصل فی الملل والاھواء والنحل)۔

حضرت علی نے وظائف کی رقوم یکساں کیں۔

حضرت علی کی سرکاری مہر پر 'اللہ الملک' کندہ تھا، کبھی کبھی 'محمد رسول اللہ' عبارت والی مہر بھی استعمال کر لیتے۔

مسلمانوں کے باہم برسرپیکار ہونے کی وجہ سے حضرت علی کے عہد میں قانون بین الملل (international law) کی ذیلی قسم قانون بین المسلمین وجود میں آئی۔

حضرت علی نے ایک اہم عدالتی اصلاح یہ کی کہ ایک گواہ دوسرے گواہ کا بیان سن نہ پاتا تھا۔ اس طرح جھوٹے گواہ کی حوصلہ شکنی ہوئی، کیونکہ وہ دوسرے گواہوں کے بیانات سن کر ایک نیا بیان گھڑ لیتا تھا۔

حضرت علی نے حسب ضرورت چھاؤنیاں قائم کیں۔ اصطخر کا قلعہ انھی کے دور میں تعمیر ہوا۔

حضرت علی کے عمال

حضرت عبداللہ بن عباس پہلے یمن، پھر بصرہ کے عامل رہے۔ ایک روایت کے مطابق وہ حضرت علی کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔ تمام صدقات اور لشکروں کا انتظام بھی ان کے سپرد تھا۔ بصرہ کا منصب قضا ابوالاسود دوئلی کے پاس تھا۔ حضرت عبید اللہ بن عباس بحرین اور اس کے قرب وجوار پر مامور تھے۔ طائف، مکہ اور قرب وجوار کا علاقہ حضرت قثم بن عباس کی عمل داری میں تھا۔ زیاد بن ابیہ فارس کے گورنر رہے۔ حضرت ابوایوب انصاری (یا حضرت سہل بن حنیف) مدینہ کے عامل تھے۔ حضرت علی نے شریح بن حارث کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا، پھر معزول کر دیا۔ اقتدار حضرت معاویہ کے پاس آیا تو انھوں نے شریح کو بحال کر دیا۔ وہ اس منصب پر ستر سال، اپنی وفات تک فائز رہے۔

عمال کو ہدایات

حضرت علی محاصل و خراج کی آمدنی کا سختی سے حساب کرتے تھے۔ حضرت یزید بن قیس ارحبی نے خراج بھیجنے میں تاخیر کی تو ان کا مواخذہ کیا۔ عراق کے حکام کی تحقیقات کے لیے حضرت کعب بن مالک کو بھیجا۔ حضرت نعمان بن عجلان کے بارے میں خبر ملی کہ انھوں نے خراج کا مال صحیح مصرف پر خرچ نہیں کیا تو انھیں سخت تنبیہ کی۔ حضرت علی یہ حکم دیتے تھے کہ جن زمینوں کا خراج حاصل کر رہے ہو، ان کی آبادی اور شادابی کی کوشش بھی کرو۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایک عامل کو ہدایات لکھیں: خراج کی وصولی میں اپنی طرف سے کوئی رعایت یا معافی نہ کرنا۔ لوگ اس معاملے میں تمھاری طرف سے کم زوری نہ پائیں۔ لوگوں کے گرمی، سردی کے لباس، ان کی خوراک اور بار برداری کے جانور ہر گز نہ بیچنا۔ خراج وصول کرنے کے لیے درے نہ لگانا، وصولی کے لیے کسی دوسرے شخص کو مسلط نہ کرنا۔ اسے تنبیہ کی کہ اگر میری ہدایات کی خلاف ورزی کی تو میں تمھیں معزول کر دوں گا۔ اس نے جواب دیا: ان پر عمل کرنے کی صورت میں تو میں خالی ہاتھ لوٹ آؤں گا۔ حضرت علی نے فرمایا: اگرچہ تو خالی ہاتھ لوٹے تمھیں ان پر عمل کرنا ہو گا۔ تاہم عامل کہتا ہے: مجھے (اپنی توقع کے برعکس) پورا پورا خراج موصول ہوا (کتاب امام ابویوسف، الخراج ۱۶۔ یحییٰ بن آدم، رقم ۲۳۴)۔

بنو اسد کے عامل ضبیعہ بن زہیر نے فرائض کی انجام دہی کے دوران میں ملنے والے چند ہدیے حضرت علی کو پیش کیے اور پوچھا: اگر یہ میرے لیے حلال ہوں تو میں استعمال کر لوں؟ حضرت علی نے فرمایا: اگر تم یہ چیزیں نہ دیتے تو یہ غلول (خیانت) کے حکم میں آ جاتیں (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۲۳۹۶)۔

حضرت علی نے اپنے عمال کی اخلاقی نگرانی بھی کی۔ والی اصطخر منذر بن جارود کے متعلق علم ہوا کہ وہ اپنے

فرائض چھوڑ کر سیر و شکار کو نکل جاتے ہیں تو انھیں بر طرف کر دیا۔ بخورات اور روغنیات کا استعمال کرنے پر ایک عامل کو تہدید کا خط لکھا۔

عدل و مساوات

دو عورتیں مالی اعانت کے لیے حضرت علی کے پاس آئیں، ایک عرب (حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے) اور دوسری اس کی لونڈی (حضرت اسحٰق کی نسل میں سے) تھی۔ حضرت علی نے دونوں کو برابر، ایک کُرّ (حجازی پیمانے کے اعتبار سے چالیس من بیس سیر یاساڑھے پندرہ سو کلو سے کچھ اوپر) غلہ اور چالیس درہم دینے کا حکم دیا۔ خادمہ تو جو ملا، لے کر چلی گئی، لیکن عرب عورت نے اعتراض کیا: امیر المومنین، آپ نے ہم دونوں کو ایک ہی مقدار میں غلہ اور نقدی عنایت کی ہے۔ حضرت علی نے جواب دیا: میں نے اللہ کی کتاب میں غور کیا ہے، اس مسئلہ میں اولاد اسمٰعیل کو اولاد اسحٰق پر کوئی فوقیت نہیں (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۲۹۹۰)۔

حضرت علی نے ایک نصرانی کو زرہ فروخت کرتے دیکھا تو فرمایا: یہ میری زرہ ہے، میں نے نہ بیچی نہ ہبہ کی۔ نصرانی نہ مانا اور کہا: مسلمانوں کے قاضی کے پاس چل کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مقدمہ مشہور قاضی شریح کے پاس پیش ہوا۔ عیسائی نے کہا: میں امیر المومنین کو جھٹلاتا تو نہیں، لیکن یہ زرہ میری ہے۔ قاضی نے حضرت علی سے گواہی مانگی تو حضرت علی ہنس پڑے اور کہا: میرے پاس کوئی گواہ نہیں۔ دوسری روایت کے مطابق انھوں نے اپنے بیٹے اور اپنے غلام قنبر کی شہادتیں پیش کیں۔ قاضی شریح نے باپ کے حق میں بیٹے اور آقا کے حق میں غلام کی شہادتیں رد کرتے ہوئے نصرانی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ حضرت علی نے نہ صرف یہ کہ فیصلہ قبول کیا، بلکہ قاضی کی تنخواہ میں اضافہ بھی کر دیا۔ نصرانی نے زرہ پکڑ لی، لیکن چند قدم چلنے کے بعد لوٹ آیا اور کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ انبیا کے فیصلے ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ واللہ، یہ زرہ آپ ہی کی ہے، آپ صفین کو جا رہے تھے کہ میں نے لشکر کا پیچھا کیا اور آپ کے مٹیالے اونٹ سے زرہ نکال لی۔ حضرت علی نے کہا: تو مسلمان ہو گیا ہے تو زرہ اپنے پاس رہنے دے، پھر اسے سواری کے لیے گھوڑا بھی عنایت کر دیا۔ وہ خوارج کے خلاف جنگ میں حضرت علی کے ساتھ شریک رہا۔

جذبۂ خیر خواہی

ایک دفعہ ایک ایسے شخص کا جنازہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا جس کے ذمے قرض تھا اور اس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے ترکہ میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے قرض اتارا جا سکتا۔ آپ نے صحابہ کو حکم دیا: اپنے ساتھی کی نماز جنازہ خود ادا کر لو۔ اس موقع پر حضرت علی نے کہا: یا رسول اللہ، اس کے قرض کی ذمہ داری میں لیتا ہوں، تب آپ جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور فرمایا: علی، تم نے اپنے مسلم بھائی کی گردن قرض سے آزاد کرائی ہے، اللہ روز قیامت تمھاری گردن آتش جہنم سے آزاد کرے گا (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۱۷۳۲۔ سنن دار قطنی، رقم ۲۹۱)۔

حضرت علی بازار میں

ایک بار حضرت علی بازار میں تشریف لائے تو دو موٹی چادریں زیب تن کر رکھی تھیں، تہ بند نصف ساق سے اوپر تھا، ہاتھ میں درہ پکڑا ہوا تھا اور لوگوں سے کہہ رہے تھے: اللہ سے خوف کرو، خرید و فروخت میں راست بازی سے کام لو اور ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو (البدایہ والنہایہ)۔

حضرت علی بازار سے گزرتے تو لوگوں کو سلام کرتے جاتے (طبقات ابن سعد، صفۃ علی بن ابی طالب)۔

اجناس کے نرخوں اور ناپ تول کی دیکھ بھال حضرت علی خود کرتے تھے۔

حضرت علی ایک بار لباس خریدنے کے لیے بازار گئے تو دکان دار سے پوچھا: تم مجھے پہچانتے ہو؟ اس کے ہاں کہنے پر آگے بڑھ گئے اور دوسرے دکان دار سے یہی سوال کیا۔ جب اس نے کہا: میں آپ کو نہیں جانتا تو اس سے قمیص کے لیے کپڑا خریدا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد تھا کہ اگر دکان دار واقف ہوا تو لباس کی صحیح قیمت لے نہ پائے گا (طبقات ابن سعد، علی بن ابی طالب)۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص نصیحتیں

حضرت علی فرماتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو وقت حاضر ہوتا تھا۔ دن کے وقت تو آپ مجھے اندر آنے کی اجازت دے دیتے۔ رات کو یا سحر کے وقت میں جا کر 'السلام علیک یا نبي اللہ' کہتا۔ آپ فارغ ہوتے تو اذن دے دیتے اور اگر آپ نوافل میں مشغول ہوتے تو کھنکھارتے اور میں لوٹ آتا (نسائی، رقم ۱۲۱۳-۱۲۱۴۔ ابن ماجہ، رقم ۳۷۰۸)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا: میں تمھیں ایسے کلمات نہ سکھا دوں جب تم ادا کرو تو تمھاری مغفرت ہو جائے، حالاں کہ تم بخشے بخشائے ہو: 'لا إله إلا الله الحليم الكريم، لا إله إلا الله العلي العظيم، سبحان الله رب السماوات السبع و رب العرش العظيم، الحمد لله رب العالمين'، "کوئی معبود نہیں، مگر اللہ جو بردبار اور مہربان ہے، کوئی معبود نہیں، مگر اللہ جو بلند اور عظمت والا ہے، پاکی ہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اللہ کے لیے جو سات آسمانوں کا رب اور عظیم الشان عرش کا مالک ہے، تمام ستایش اللہ کے لیے ہیں جو جہانوں کا پروردگار ہے‘‘(ترمذی، رقم ۳۵۰۴۔ احمد، رقم ۷۱۲۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۸۳۵۶۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۹۹۶۷۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۹۲۸)۔

ایک دن حضرت علی نے حضرت فاطمہ سے کہا: کنویں سے پانی کے ڈول کھینچ کھینچ کر میرا سینہ دکھتا ہے، اللہ نے تمھارے ابا کو قیدی عطا کیے ہیں، جا کر اپنے لیے خادم لے لو۔ سیدہ فاطمہ نے کہا: واللہ، چکی پیس پیس کر میرے ہاتھوں میں بھی آبلے پڑ گئے۔ حضرت فاطمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، لیکن شرم کے مارے کہہ نہ سکیں۔ پھر حضرت علی اور حضرت فاطمہ، دونوں گئے اور یہ درخواست کی۔ آپ نے فرمایا: واللہ، تمھیں دے دوں اور اہل صفہ کو بھوکا پیٹ چھوڑ دوں، جب کہ ان پر خرچ کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ میں قیدیوں کو بیچ کر ان کی رقم اصحاب صفہ پر لگاؤں گا۔ دونوں واپس آ گئے تو آپ رات کے وقت ان کے پاس تشریف لائے۔ دونوں چادر اوڑھ کر پڑے تھے۔ آپ کو دیکھ کر اٹھنے لگے تو منع کیا اور فرمایا: میں تمھاری فرمایش سے بہتر کلمات نہ بتادوں جو مجھے جبریل نے سکھائے ہیں۔ ہر نماز کے بعد دس مرتبہ ’سبحان اللّٰہ‘، دس مرتبہ ’الحمد للّٰہ‘ اور دس مرتبہ ’اللّٰہ أكبر‘ پڑھو اور جب سونے کے لیے بستر میں داخل ہو تو تینتیس بار ’سبحان اللّٰہ‘، تینتیس بار ’الحمد للّٰہ‘ اور چونتیس بار ’اللّٰہ أكبر‘ کہہ لو۔ حضرت علی کہتے ہیں: بخدا، جب سے آپ نے مجھے یہ کلمات تلقین کیے ہیں، میں نے نہیں چھوڑے۔ ابن کوا نے پوچھا: اور صفین کی رات؟ کہا: ہاں صفین کی رات بھی نہیں چھوڑے (احمد، رقم ۸۳۸۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۹۸۷۳۔ مسند بزار، رقم ۷۵۷۔ طبقات ابن سعد، ذکر فاطمہ)۔

www.javedahmadghamidi.org

حضرت علی فرماتے ہیں: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اکیدر دومہ کا تحفے میں دیا ہوا ریشمی دھاریوں والا (mixed) جوڑا مجھے دیا جو میں نے پہن لیا۔ جب آپ کے چہرۂ مبارک پر غصے کے آثار دیکھے تو اسے پھاڑ کر گھر کی عورتوں (حضرت فاطمہ اور ان کی پھوپھی) میں بانٹ دیا (بخاری، رقم ۲۶۱۴۔ مسلم، رقم ۵۴۲۰۔ ابوداؤد، رقم ۴۰۴۳۔ نسائی، رقم ۵۳۰۰۔ احمد، رقم ۱۱۵۴)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک قیمتی جوڑا ہدیہ کیا گیا جس کے تانے یا بانے میں ریشم کی آمیزش کی گئی تھی۔ آپ نے یہ حضرت علی کو بھیج دیا۔ انھوں نے سوال کیا: یارسول اللہ، میں اس کا کیا کروں؟ کیا پہن لوں؟ فرمایا: نہیں، بلکہ اسے فاطماؤں میں اوڑھنیاں بنانے کے لیے بانٹ دو (ابن ماجہ، رقم ۳۵۹۶۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۷۴۳)۔

حضرت علی فرماتے ہیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ ان دو انگلیوں، سبابہ اور وسطیٰ

(index & middle fingers) میں انگوٹھی پہنوں، مصر سے آنے والے خانہ دار قسی کپڑے پہنوں اور کجاوے پر ڈالے جانے والے ارغوانی زین پوشوں پر بیٹھوں (مسلم، رقم ۵۴۹۰۔ابوداؤد، رقم ۴۲۲۵۔ ترمذی، رقم ۲۶۴، ۱۷۸۶۔ نسائی، رقم ۱۰۴۳۔ احمد، رقم ۱۱۲۴)۔ ترمذی اور نسائی کی روایتوں میں سونے کی انگوٹھی پہننے کی ممانعت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت فرمائی: علی، (عورت پر) ایک بار نگاہ پڑنے کے بعد دوسری نظر نہ ڈالو،اس لیے کہ (اچانک پڑ جانے کی وجہ سے) پہلی نظر تو قابل معافی ہے، جب کہ (جان بوجھ کر) دوسری نظر ڈالنا قابل مواخذہ ہے (ابوداؤد، رقم ۲۱۴۹۔ ترمذی، رقم ۲۷۷۷۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۷۸۸۔ احمد، رقم ۱۳۶۹۔ مسند بزار، رقم ۷۰۱)۔

حضرت علی نے اجازت چاہی: یارسول اللہ، اگر آپ کے بعد میرا بیٹا ہو تو کیا میں اس کا نام محمد اور آپ والی کنیت ابوالقاسم رکھ لوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، حضرت علی کہتے ہیں: یہ میرے لیے رخصت تھی (ابوداؤد، رقم ۴۹۶۷۔ ترمذی، رقم ۲۸۴۳۔ احمد، رقم ۷۳۰۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۳۰۳)۔ کیونکہ آپ کا واضح ارشاد تھا کہ کوئی آپ کے نام اور کنیت کو جمع کر کے اپنے بیٹے کا نام محمد ابوالقاسم نہ رکھے (ترمذی، رقم ۲۸۴۱)۔

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے، لیکن اندر داخل نہ ہوئے۔ حضرت علی کو پتا چلا تو آپ سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا: میں نے گھر کے دروازے پر رنگین نقش و نگار والا پردہ لٹکا دیکھا تھا۔ حضرت فاطمہ نے کہا: آپ اس بارے میں حکم فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: فلاں شخص کو بھیج دو، ان کے گھر میں ضرورت ہے (بخاری، رقم ۲۶۱۳۔ ابوداؤد، رقم ۴۱۴۹۔ احمد، رقم ۴۷۲۷۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۵۵۱۵)۔ دوسری روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہ اور حضرت علی کے ساتھ کسی اور شخص کے گھر جانے کا ذکر ہے۔ آپ نے وہاں منقش رنگین (یا باریک) پردہ لٹکا دیکھا تو لوٹ آئے اور فرمایا: مجھے یا کسی نبی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ آرایش و زیبایش والے گھر میں داخل ہو (ابوداؤد، رقم ۳۷۵۵۔ ابن ماجہ، رقم ۳۳۶۰۔ احمد، رقم ۲۱۹۲۲)۔

حضرت علی نے حضرت فاطمہ کی زندگی میں ابوجہل کی بیٹی کو نکاح کا پیغام بھیجا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر خطاب فرمایا: فاطمہ، میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے، مجھے یہ پسند نہیں کہ کوئی اسے تکلیف دے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے دین میں کسی فتنہ (جلاپا یا حسد) میں نہ پڑ جائے... میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا، لیکن اللہ کی قسم، رسول اللہ کی بیٹی اور دشمن خدا (ابوجہل) کی بیٹی ایک گھر میں کبھی جمع نہ ہوں

گی (بخاری، رقم ۳۱۱۰، ۳۷۲۹۔ مسلم، رقم ۶۳۰۹۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۶۹۔ احمد، رقم ۱۶۱۲۳)۔ دوسری روایت میں ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر ایستادہ ہو کر فرمایا: ہشام بن مغیرہ کے پوتوں (ابوجہل کے بیٹوں) نے مجھ سے اجازت مانگی ہے کہ وہ اپنی بیٹی علی سے بیاہنا چاہتے ہیں۔ میں اجازت نہ دوں گا، میں اجازت نہ دوں گا، میں اجازت نہ دوں گا، ہاں ابو طالب کا بیٹا اگر چاہتا ہے تو میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی بیٹی سے نکاح کر لے (بخاری، رقم ۵۲۳۰۔ مسلم، رقم ۶۳۰۷۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۷۱۔ ترمذی، رقم ۳۸۶۷۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۹۸)۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی حضرت منذر بنت قیس انصاریہ کے گھر گئے جہاں انگوروں کے خوشے لٹک رہے تھے۔ آپ کھڑے ہو کر کھانے لگے۔ حضرت علی بھی آگے بڑھے تو آپ نے منع کر دیا اور فرمایا: تم ابھی بیماری سے اٹھے ہو۔ حضرت منذر جو اور چقندر بنا کر لائیں تو آپ نے فرمایا: یہ کھاؤ، یہ تمھارے لیے مفید ہے (ابوداؤد، رقم ۳۸۵۶۔ ترمذی، رقم ۲۰۳۷۔ ابن ماجہ، رقم ۳۴۴۲۔ احمد، رقم ۲۷۰۵۱)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو دو غلام بھائی ہدیہ کیے۔ انھوں نے ان میں سے ایک بیچ دیا۔ آپ کو پتا چلا تو اسے فوراً واپس لانے کا حکم دیا اور فرمایا: دونوں کو ایک ساتھ بیچو یا دونوں کو پاس رکھو (ترمذی، رقم ۱۲۸۴۔ ابن ماجہ، رقم ۲۲۴۹۔ احمد، رقم ۷۶۰۔ مسند بزار، رقم ۶۲۴)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت علی نے ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے ایک خادم عنایت کریں۔ آپ نے فرمایا: گھر میں تین ہیں، ایک تم لے لو۔ حضرت علی نے کہا: آپ خود ہی چن کر دے دیں۔ آپ نے ایک غلام دیا اور نصیحت فرمائی: اسے مت مارنا، میں نے اسے نماز پڑھتے دیکھا ہے اور ہمیں نمازیوں کو پیٹنے سے منع کیا گیا ہے (احمد، رقم ۲۲۱۵۴۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۸۱۰۰)۔

حضرت حسن کو نصیحت

حضرت علی نے فرمایا: بیٹے، کسی ملنے والے کی تحقیر نہ کرنا، تجھ سے بڑا ہو تو اپنے باپ کی جگہ شمار کرنا، ہم عمر ہو تو بھائی سمجھنا اور اگر چھوٹا ہو تو بیٹے کی طرح برتاؤ کرنا۔

حرمت خمر

حرمت شراب کا حکم نازل ہونے سے ایک انصاری صحابی نے حضرت علی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی دعوت کی اور انھیں شراب پلا دی۔ حضرت علی مغرب کی نماز پڑھانے کھڑے ہوئے اور سورۂ کافرون کی تلاوت شروع کی۔ انھوں نے آیات کو خلط ملط کر دیا تو حکم ربانی نازل ہوا: 'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا

الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ'، "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نشے کے حال میں نماز کے پاس نہ جایا کرو، یہاں تک کہ تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو" (النساء ۴: ۴۳۔ ابوداؤد، رقم ۳۶۷۱)۔

اصحاب رسول کی شکررنجیاں

جب افک عائشہ کا واقعہ ہوا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ اور حضرت علی سے مشورہ کیا۔ حضرت اسامہ نے کہا، وہ آپ کی اہلیہ ہیں، ہم تو ان کی بھلائی ہی جانتے ہیں۔ حضرت علی نے کہا: یارسول اللہ، اللہ نے آپ پر تنگی نہیں کی۔ عائشہ کے علاوہ بھی بے شمار عورتیں ہیں۔ آپ ان کی باندی بریرہ سے پوچھیں، وہ سچ بتا دے گی۔ آپ نے حضرت بریرہ کو بلا کر سوال کیا: کیا تم نے عائشہ میں کوئی قابل اعتراض بات دیکھی ہے؟ اس نے کہا: میں نے اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھی کہ وہ نو عمر ہیں، آٹا کھلا رکھ کر سو جاتی ہیں اور گھر کی پالتو کبوتری اسے کھا جاتی ہے (بخاری، رقم ۲۶۶۱)۔

خلیفۂ اول ابوبکر کی بیعت ہو چکی تو وہ منبر پر بیٹھے اور حاضرین پر ایک نظر ڈالی۔ انھیں حضرت زبیر اور حضرت علی دکھائی نہ دیے تو انھیں بلایا اور کہا: کیا تم ملت اسلامیہ کی مخالفت کرنا چاہتے ہو؟ دونوں نے معذرت کر کے ان کی بیعت کر لی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ایک شخص حمران نے عہد عثمانی کے گورنر کوفہ حضرت ولید بن عقبہ کے خلاف گواہی دی کہ انھوں نے فجر کی دو رکعتیں پڑھانے کے بعد (نشے کی حالت میں) لوگوں سے پوچھا: کیا اور پڑھاؤں؟ ایک اور آدمی نے شہادت دی کہ اس نے انھیں قے کرتے دیکھا ہے۔ حضرت علی نے ان پر حد جاری کرنے کا مشورہ دیا۔ حضرت عثمان نے انھیں ہی کوڑے لگانے کو کہا۔ انھوں نے حضرت حسن کو کہہ دیا۔ حضرت حسن نے ناراض ہو کر جواب دیا: امور خلافت میں سے مشکل (اور گرم) کام اسی کو دیں جس نے آسان (اور ٹھنڈے) کام اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ تب حضرت عثمان کے کہنے پر حضرت عبداللہ بن جعفر نے کوڑے لگائے، حضرت علی نے چالیس تک گنتی پوری کی (مسلم، رقم ۴۴۵۷۔ ابوداؤد، رقم ۴۴۸۰۔ احمد، رقم ۶۲۴۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۹۹۸۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۵۰۴)۔

حضرت علی نے حضرت محمد بن مسلمہ کو بلا کر پوچھا: تمھیں جہاد میں شامل ہونے سے کس شے نے روک رکھا ہے؟ انھوں نے کہا: آپ کے چچا زاد، (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے تلوار سونپ کر فرمایا تھا: اسے اس وقت تک استعمال کرنا جب تک دشمن سے قتال کیا جائے۔ جب تو دیکھے کہ لوگ (مسلمان) ایک

دوسرے کو قتل کر رہے ہیں تو تلوار لے کر کسی چٹان پر چلے جانا اور اس پر ضرب لگا کر کے اسے توڑ دینا۔ پھر گھر سے چپکے رہنا، حتیٰ کہ فیصلہ کن موت آ جائے یا گناہ گار حاکم پکڑ لے۔ حضرت علی نے یہ ارشاد سن کر کہا: ان کو جانے دو (احمد، رقم ۱۷۹۷۹۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۸۳۰۴۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۵۸۶۵)۔

حضرت اسامہ بن زید مسلمانوں کی باہمی جنگ کو اچھا نہ سمجھتے تھے، اس لیے جمل و صفین کی جنگوں میں حضرت علی کے ساتھ شریک نہ ہوئے۔ بعد میں انھوں نے کسی ضرورت کے لیے اپنے غلام حرملہ کو حضرت علی کے پاس بھیجا تو انھوں نے کچھ نہ دیا، لیکن جب حرملہ حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت عبداللہ بن جعفر کے پاس پہنچا تو انھوں نے اتنا مال لدوا دیا کہ اونٹ کے لیے اٹھانا مشکل ہو گیا (بخاری، رقم ۷۱۱۰)۔

حضرت اہبان بن صیفی (حضرت حکم بن عمرو غفاری: حاکم) صحت یاب ہوئے تو حضرت علی بصرہ میں ان کے گھر گئے اور انھیں اپنی فوج میں شامل ہو کر جنگ پر جانے کی دعوت دی۔ انھوں نے جواب دیا: میرے خلیل اور آپ کے چچا زاد صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نصیحت فرمائی تھی: جب مسلمانوں کے بیچ فتنہ برپا ہو جائے تو تم لکڑی کی ایک تلوار پکڑ لینا۔ میں نے یہ تلوار تھام لی ہے، اگر آپ کہتے ہیں تو میں آپ کے ساتھ ہو لیتا ہوں۔ اس پر حضرت علی غصے سے لوٹ آئے اور کہا: ہمیں آپ کی نہ آپ کی تلوار کی ضرورت ہے (ترمذی، رقم ۲۲۰۳۔ ابن ماجہ، رقم ۳۹۶۰۔ احمد، رقم ۲۰۶۷۰۔ مستدرک حاکم، رقم ۵۸۶۷۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۸۴۵۷)۔ ابن حجر کہتے ہیں: اہبان صحابی نہ تھے، وہ اپنے ماموں حضرت ابوذر غفاری سے سماع کردہ روایتیں بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہ کی موجودگی میں حضرت بسر بن ارطاۃ نے حضرت علی کو گالم گلوچ کی۔ حضرت عمر کے بیٹے زید بھی موجود تھے جو حضرت علی کی بیٹی ام کلثوم کے بطن سے تھے۔ انھوں نے ڈنڈا مار کر حضرت بسر کا سر پھاڑ دیا۔ حضرت معاویہ نے ان دونوں میں صلح کرائی۔

حضرت علی کا تقویٰ اور امانت

حضرت علی نے ایک بار فرمایا: میں نے مال فے سے یہ ایک پیالہ ہی لیا ہے جو ایک کسان نے مجھے ہدیہ کیا تھا۔

حضرت علی کی خادمہ حاضر ہوئی تو آپ کے سامنے قرنفل (لونگ) کا ہار پڑا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کے لیے مانگا تو کہا: یہ مسلمانوں کا مال ہے، درہم دکھا کر لے لو یا کچھ صبر کر لو۔ ہمارے حصے میں آیا تو ہم تمھاری بیٹی کو ہبہ کر دیں گے (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۳۳۵۷۳)۔

ایک بار کچھ لیموں حضرت علی کی خدمت میں لائے گئے۔ حضرات حسنین اپنے لیے اٹھانے لگے تو ان کے ہاتھ سے لے لیے اور حکم دیا کہ انھیں مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے (مصنف ابن ابی شیبہ ۱۳/ ۲۸۲)۔

حضرت علی کے عہد میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ابو رافع بیت المال کا خزانچی تھا۔ ایک دن انھوں نے دیکھا کہ اس کی بیٹی نے خوب بناؤ سنگھار کر رکھا ہے اور بیت المال کا ایک قیمتی موتی ٹانک رکھا ہے۔ انھوں نے غلام سے پوچھا: یہ موتی اس کے پاس کیسے آیا، خدا کی قسم، اب مجھ پر اس کا ہاتھ کاٹنا لازم ہے۔ ذرا دھمکانے پر وہ مان گیا کہ اس نے یہ بیت المال سے لیا ہے۔ حضرت علی نے موتی واپس جمع کرایا اور کہا: میری سیدہ فاطمہ سے شادی ہوئی تو میرے پاس کوئی بستر نہ تھا۔ بکرے کی ایک کھال تھی، جس پر ہم رات کو سوتے اور دن کے وقت اسی پر چارہ بنا کر اپنی اونٹنی کو کھلاتے۔

اصفہان سے مال غنیمت آیا تو حضرت علی نے اسے فوج کے سات یونٹوں کے مطابق سات حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک روٹی تقسیم ہونے سے بچ گئی تو اس کے بھی سات ٹکڑے کر کے مال کے ساتوں حصوں پر رکھوا دیے۔ پھر قرعہ ڈالا کہ کس یونٹ کو پہلے غنیمت دی جائے (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۲۹۸۹)۔

حضرت علی خورنق میں تھے، سخت سردی کے موسم میں ایک پھٹی ہوئی اونی چادر تھی جسے اوڑھ کر کپکپا رہے تھے۔ واقعہ بیان کرنے والے ہارون بن عنترہ نے کہا: امیر المومنین، اللہ نے اس مال میں آپ کا اور آپ کے اہل خانہ کا حصہ مقرر کر رکھا ہے۔ جواب دیا: میں تم سے کچھ نہیں لینا چاہتا، یہ چادر میں مدینہ سے لے کر آیا تھا۔

حضرت علی کے مقررہ گورنر اصفہان عمرو بن سلمہ کچھ مال اور مشکیزے لائے جن میں شہد اور گھی تھا۔ ان کی صاحب زادی ام کلثوم کو پتا چلا تو ایک مشکیزہ شہد اور ایک گھی کا منگوا لیا۔ اگلے روز امیر المومنین مال غنیمت تقسیم کرنے لگے تو اپنی کی ہوئی گنتی میں سے دو مشکیزے کم پائے۔ عمرو سے پوچھا: انھوں نے پہلے تو چھپایا، لیکن حضرت علی کے اصرار پر بتا دیا۔ فوراً ام کلثوم سے مشکیزے منگوائے گئے تو ان میں کچھ گھی اور شہد کم نکلا۔ تاجروں سے استعمال شدہ شہد اور گھی کی قیمت لگوائی گئی تو تین درہم نکلی۔ حضرت علی نے ام کلثوم سے یہ رقم وصول کی تو مال غنیمت بانٹا۔

حضرت علی کا معمول تھا کہ روزانہ بیت المال خالی کر کے سوتے۔ اگر کسی مصروفیت سے ایسا نہ ہو پاتا تو علی الصبح یہ کام کرتے اور پکارتے: اے دنیا، کسی اور کو دے لے، مجھے دھوکا نہ دینا۔ ایک بار بیت المال میں موجود تمام مال مسلمانوں میں تقسیم کر کے جھاڑو لگوایا اور اس میں نوافل ادا کر کے اللہ سے امید ظاہر کی کہ یہ روز قیامت ان

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے حق میں گواہی دے گا(الاستیعاب)۔

حضرت علی اس تھیلے کے منہ پر جس میں ان کا جو کا آٹا ہوتا، مہر لگا دیتے اور کہتے: میں چاہتا ہوں کہ میرے پیٹ میں وہی جائے جس کا مجھے علم ہو۔

کار خویش بدست خویش

حضرت علی نے ایک درہم کی کھجوریں خرید کر کپڑے میں لپیٹ لیں۔ لوگوں نے کہا: ہم اٹھا لیتے ہیں تو کہا: کنبے کا سربراہ اسے اٹھانے کا زیادہ حق رکھتا ہے (الادب المفرد، بخاری: باب الکبر)۔

وادی الفرع میں موجود حضرت فاطمہ کے چشمے اور نخلستان کی نگہداشت حضرت علی خود کرتے تھے۔ نجاشی کے بیٹے ابو نیزر کے نام سے موسوم چشمہ حضرت علی نے خود کھودا۔

رعایا کے قضیوں کا حل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایک بار حضرت علی قبیلہ ہمدان گئے اور دو گروہوں کو باہم دست و گریباں دیکھا۔ وہ ان کے بیچ گھس گئے اور انھیں الگ الگ کر دیا۔ ایک آدمی نے مدد کے لیے پکارا اور بتایا کہ میں نے اس شخص کو کپڑا فروخت کیا ہے۔ اس نے دام میں کٹے ہوئے، کھوٹے درہم دے دیے۔ میں نے تبدیل کرنے کو کہا تو مجھے طمانچہ مار دیا۔ حضرت علی نے اس کے دعوے پر گواہی لی اور قصاص لینے کو کہا۔ اس نے معاف کر دیا تو نو کوڑے مارنے کے بعد کہا: یہ سلطان کی طرف سے سزا ہے۔ اس طرح کی دوسری روایت میں کپڑے کی جگہ بکری کے سودے کا ذکر ہے۔

مطالعۂ مزید: الجامع المسند الصحیح (بخاری، شرکۃ دار الارقم)، المسند الصحیح المختصر (مسلم: صالح بن عبد العزیز)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبد البر)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، تاریخ اسلام (شاہ معین الدین)، تاریخ اسلام (اکبر شاہ نجیب آبادی)، سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ (البانی)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ جات: محمد حمید اللہ، مرتضیٰ حسین فاضل)، سیرت علی المرتضیٰ (محمد نافع)۔

[باقی]

محمد تہامی بشر علوی

حیات پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ بتائیے! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے ہیں؟ تو سیدہ عائشہ نے بڑا جامع اور بامعنی جواب دیا۔ وہ چاہتیں تو بہت زیادہ تفصیل بیان کر سکتی تھیں، لیکن انھوں نے اپنی ذہانت و بصیرت کے ساتھ نہایت مختصر سے جملے میں گہرا جواب دے دیا، فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن ہی تو ہے[1]۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ماہ و سال کا اس سے زیادہ جامع اور خوب صورت انداز میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سیدہ کو ملی قدرت کی طرف سے غیر معمولی بصیرت ہی تھی جس کے ہوتے ہوئے یہ جواب ممکن ہو پایا ہے۔ اس جملے سے سیدہ کا مدعا یہ تھا کہ خداوند عالم نے قرآن مجید میں انسانوں سے جو جو مطالبات کیے ہیں، محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی انھی خدائی مطالبات کی خوب صورتی سے تکمیل کا نام ہے۔ انسان کی زندگی میں اہم ترین چیز انسان کا اخلاقی وجود ہوتا ہے۔

خدائی مطالبات کی فہرست اٹھا کر دیکھ لیجیے، اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کس طرح ہم سے ہمارے اخلاقی وجود کی پاکیزگی کا اہتمام چاہتا ہے۔ قرآن مجید کے دیے ہوئے اعلیٰ مومنانہ اخلاق کے معیار پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پوری طرح پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید بتاتا ہے کہ تمھارا رب غصہ پی جانے والوں کو بہت پسند کرتا ہے، تو اس زمین پر سب سے زیادہ غصہ پی جانے والی شخصیت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ احمد، رقم ۲۵۳۰۲۔ ’عَنْ سَعْدِ بْنِ هِشَامٍ، قَالَ: سَأَلْتُ عَائِشَةَ، فَقُلْتُ: أَخْبِرِينِي عَنْ خُلُقِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ‘۔

کے علاوہ کوئی اور نہیں دکھائی جا سکتی۔ تلخی کے کیسے کیسے مواقع آتے رہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنا ناحق ستایا جاتا رہا، اذیت سے دوچار کیا جاتا رہا، سچائی کی بات قوم کو بتانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر ستم روا رکھا گیا، طائف کی وادی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس ستم سے دوچار کیا گیا؟ مگر یہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات تھی جس کا پایۂ استقامت لمحے بھر کے لیے بھی نہیں ڈگمگایا۔ آپ نے ایسے ہر موقع پر نہایت حلم کا رویہ برقرار رکھا؛ کہیں بھی کوئی جذباتی یا غصے والا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

طائف والوں کے تشدد کا جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسلوں کو دعاے ہدایت دے کر دیا۔ اس سے بڑھ کر بھلا کون خود کو خدا کی خاطر انتقام کی زندگی سے اٹھا کر مکمل حلم و درگذر کی زندگی پر ڈال سکتا ہے؟ قرآن مجید نے بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجود کرنے والے، اس کے سامنے قیام کرنے والے اور اس کو رات گئے تک یاد کرنے والے خدا کو بڑے پسند ہیں، تو اس زمین پر اللہ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اس ہدایت پر عمل کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ پھر قرآن مجید نے یہ توجہ دلائی کہ بدلہ لینے والوں کے بجاے معاف کرنے والے لوگ خدا کو زیادہ پسند ہیں، تو اس روے زمین پر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن مجید نے انسانوں سے جو جو مطالبہ بھی کیا؛ جن جن اچھائیوں کا ذکر کیا، ان اچھائیوں کو سب سے اچھے طریقے پر اگر کسی نے کر دکھایا تو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دکھایا۔ تبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں کے لیے اسوہ قرار دیا گیا[۲]، یعنی خدائی مطالبات کو خوبی کے ساتھ پورا کر دکھانے والی ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کو سامنے رکھ کر خدائی مطالبات کی تکمیل کرتے ہوئے زندگی بسر کریں۔ اس پہلو سے دیکھیے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب بہت جامع اور گہرا ہے۔

دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وہ زندگی ہے جس کی پیروی کے بغیر ہمارے لیے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبتوں کا مستحق بننے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو لازم

۲۔ الاحزاب ۳۳: ۲۱۔ 'لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا'۔

قرار دیا ہے[۳]۔

ہمارے ہاں مذہبی ظاہر پرستی کے مارے لوگوں نے مخصوص لباس اور مخصوص وضع قطع کو مسنون زندگی کے طور پر متعارف کروا کر دین پر ستم ڈھار کھا ہے۔ اچھی طرح سمجھنا چاہیے کہ خدا نے لوگوں سے کسی مخصوص لباس کا مطالبہ اپنی کتاب میں کہیں نہیں کیا۔ لباس لوگ اپنے ماحول اور ضرورت کے لحاظ سے پہنتے رہیں گے۔ خدا لباس میں حیا اور پاکیزگی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ یہ ذوقی چیزیں ہیں کہ لوگ محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس جیسا لباس پہنیں، ان کے پسند کردہ کھانے استعمال میں لائیں، لیکن ان ذوقی چیزوں کو دینی مطالبات میں شامل کرنا یا یہ کہ ان امور کو اصل دینی مطالبات پر نمایاں کر دینا، بلاشبہ ایک غلط رویہ ہے، جس کی اصلاح ضروری ہے۔ ''مسنون زندگی'' کا لفظ سن کر ہمارے ذہنوں میں کُرتے، مسواک اور پگڑی کے بجائے صبر، درگذر اور اخلاص والی زندگی کا تصور پہلے آنا چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دینی اسوہ یہی امور تھے۔ دینی اسوہ میں صبر، ایثار، اخلاص، سجود، یاد خدا، محبت، ہم دردی، خدمت خلق، حسن اخلاق، رواداری، تدبر، انکساری، قناعت، شکر گزاری، مثبت response اور قرآن مجید پر تدبر وغیرہ جیسے امور شامل ہیں۔ لباس اور کھانے پینے جیسے امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کے اہل عرب والے لباس اور کھانوں کو ہی اختیار فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنین کے لیے الگ کھانے یا الگ لباس تجویز نہیں کیے۔ صحابۂ کرام کو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے لباس اور کھانے نہیں ترک کرنا پڑتے تھے، الّا یہ کہ کسی لباس اور کھانے میں کسی پہلو سے کوئی قباحت پائی جاتی ہو۔ یہی معاملہ ناموں کا بھی تھا۔ لوگ عربی زبان میں اپنے نام رکھا کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسلام قبول کرنے والوں کے نام تبدیل نہیں کرایا کرتے تھے۔ صرف ان ناموں کو تبدیل کرایا کرتے تھے جن کے معنی میں کوئی خرابی ہو۔ لوگوں نے ان عربی ناموں کو اسلامی ناموں کے نام سے مشہور کر دیا اور اب اسلام قبول کرنے والوں کو ان کے اپنی زبان میں اچھے معنی والے ناموں کو بھی خواہ مخواہ بدلنے کی زحمت میں ڈال دیا جاتا ہے۔

آج کے زمانے میں نام بدلنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ کئی جگہ اپنا ریکارڈ درست کرانا پڑتا ہے۔ اور اس کے لیے بھی اچھی خاصی زحمت سہنی پڑتی ہے۔ لوگوں کو اس مصیبت میں خواہ مخواہ ڈالنا کم سے کم الفاظ میں بھی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۳۔ آل عمران ۳: ۳۱۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

بد فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ ہندی تہذیب سے وابستہ لوگ ہندی میں نام رکھیں گے، انگریزی تہذیب والے اپنی زبان میں نام رکھیں گے۔ ان کے معنی میں کوئی برائی نہ ہو تو ان کا وہی نام درست ہے، اسے بدل کر کوئی عربی نام رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں بھی سب نام عربی ہی تو نہیں ہوتے، فارسی اور اردو میں بھی کئی نام ہمارے ہاں مشہور ہیں —— مثلاً گلناز، مہ جبین، مہ پارہ، جاوید، خدابخش، اللہ دتہ وغیرہ، یہ سب نام غیر عربی نام ہیں، مگر ان سے ہم مانوس ہو گئے، اس لیے کوئی اجنبیت نہیں ہوتی۔ کسی کو یہ نام غیر اسلامی نہیں لگتے۔ اب آپ دیکھیں یہ خورشید فارسی زبان کا نام ہے جو ہمارے ہاں بھی مقبول ہے۔ لوگ اسے غیر اسلامی نام نہیں سمجھتے۔ خورشید کو بدل کر کوئی عربی نام تجویز نہیں کرتے، لیکن کسی کے انگریزی یا ہندی نام کو سنتے ہی ہم غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔ یہ بد فہمی نہیں تو بتائیے اور کیا ہے؟ ایسا دوسری تہذیبوں سے نفرت یا نامانوسیت کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا سبب جو بھی ہو، یہ واضح ہے کہ اس کا تعلق اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بات ہو رہی تھی کہ مسنون زندگی کا تصور درست کرنے کی ضرورت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی مطالبات کی تکمیل میں جو کام کیے، انھیں ذوقی اور عرفی کاموں سے الگ کر کے سمجھنا چاہیے۔ دینی اسوہ کی پیروی ہمارا دینی فریضہ ہے۔ ذوقی امور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی محبت کے اظہار کا ایک فطری طریقہ ہے۔ لوگ اپنے مقتدا کی پیروی ذوقی امور میں بھی ذوق سے کیا کرتے ہیں۔ انھیں محبت کے اس فطری اظہار سے روکنا غیر فطری ہے، مگر انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ دینی امور میں اور ذوقی امور میں فرق کیا ہے؟ یہ نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے ذوقی چیزیں اپنانا کافی سمجھ لیا ہے اور دینی اسوہ کو نظر انداز کر ڈالا ہے۔ اسی غلط فہمی کے باعث آپ کو کرتا پہننے والے تو معاشرے میں بہت مل جائیں گے، لیکن گالیاں سن کر صبر کر جانے والا کہیں مشکل سے ہی کوئی مل پائے گا، حالاں کہ کُرتا پہننا کوئی خدائی مطالبہ نہیں، جب کہ غصہ پی جانا خدائی مطالبہ ہے۔ غصہ پی جانا ایک دینی حکم ہے، جب کہ کُرتے کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ گالی تو چھوڑیے، آپ بھلے آزمانے کے لیے کسی سے ذرا غصے میں بات کر کے دیکھیں، جواب میں وہ شعلے برسانے لگ جائے گا۔ ممکن ہے، معمولی بات پر ایسا غضب بھڑک جائے کہ آپ کو الجھ جانے والوں کی دستار زمین سے اٹھا کر پھر جھاڑ کر انھیں پیش کرنی پڑے۔ مبادا ایسا بھی ہو کہ آپ کو گالم گلوچ کرتے صاحب کو یہ توجہ دلانی پڑ جائے کہ صاحب ڈاڑھی پگڑی میں ایسی گالیاں زیب نہیں دیتیں۔

ایسے موقعوں پر خدا کے مطالبے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو سامنے رکھ کر ہمیں غصہ پی جانے کی

سنت پر عمل کر لینا چاہیے۔ حقیقی معنوں میں 'مسنون زندگی' اسی کا نام ہے۔ تعلق کاٹنے والے سے جوڑنا، برا چاہنے والوں سے اچھائی کرنا، دشمنوں سے بھی بھلائی کرنا، یہ سب حقیقی مسنون زندگی ہے اور یہی مسنون زندگی ہماری زندگی سے مکمل غائب ہو چکی ہے۔ ہمیں یہ حقیقی مسنون زندگی جینے کی فکر کرنی چاہیے، جس کا تقاضا خدا ہم سے کرتا ہے، اور اسی کی بنیاد پر کل ہماری نجات ہو پائے گی۔ اسے چھوڑ کر آپ بھلے دانتوں کی صفائی کے لیے برش کے بجائے مسواک کام میں لاتے رہیں، یوں خدا راضی نہ ہو گا۔ اپنے آپ کو دھوکا دینا حماقت ہے اور اس حماقت کو دین سمجھنا بدترین جسارت ہے۔

یہ سامنے کی حقیقت ہے کہ ہماری زندگی ایسے امور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے مکمل خالی ہے۔ پھر بھی خود کو بہلائے رکھنے کے لیے ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عشق کے نعروں کی خوب دھوم مچاتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا شخص محفوظ ہو[۴]۔ فرمایا کہ مومن وہ نہیں جو خود پیٹ بھر کے کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا سوئے[۵]۔ فرمایا کہ جو شخص دوسرے پہ حملہ آور ہونے کے لیے اس پر ہتھیار سونتے، وہ بھی میری امت میں شامل نہیں ہے[۶]۔ فرمایا: کسی کو قتل کرنا تو کفر ہے اور گالی دینا فسق ہے، خدا کی نافرمانی اس کے حدود کو توڑنا ہے۔ فرمایا: جو نماز ترک کرے، وہ کفر کا ارتکاب کر رہا[۷]۔

اب کیا ہم نہیں جانتے کہ ہم میں اِن میں سے کون سی برائی شامل نہیں؟ کس گھر میں گالی دی یا سنی نہیں جاتی؟ گالی کے چسکے نے تو بعض گالیوں کو ہمارا تکیۂ کلام بنا ڈالا ہے۔ ہمارے سماج میں، مشکل ہے کوئی ایسا بندہ مل پائے جس کی زبان پر ان گالیوں کا ورد نہ ہوتا ہو۔ پنجاب میں بسنے والی امت کا تو گالیوں میں مقابلہ ممکن ہی نہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہماری حالت ناقابل بیان حد تک خراب ہے۔ یہی خرابی ہماری نسلوں میں منتقل ہو گئی۔ یہ وہ دور ہے جہاں دنیا میں اعلیٰ اخلاقی اطوار اپنائے جا رہے ہیں۔ مہذب لوگ آج کی دنیا میں بھی آباد ہیں، مگر ہم ہیں کہ

۴۔ بخاری، رقم ۱۰۔ 'اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ'۔

۵۔ المعجم الکبیر، رقم ۱۲۷۴۱۔ 'لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالَّذِي يَشْبَعُ، وَجَارُهُ جَائِعٌ'۔

۶۔ احمد، رقم ۴۴۶۷۔ 'مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا'۔

۷۔ احمد، رقم ۲۷۳۶۴۔ 'عَنْ أُمِّ أَيْمَنَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: "لَا تَتْرُكِ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا؛ فَإِنَّهُ مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللهِ وَرَسُولِهِ"'۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پستی میں ہی اترتے چلے جا رہے ہیں۔

ہمیں غلط فہمیوں سے نکل کر اس روشنی میں آنا ہو گا جہاں ہمارے رب نے ہمیں چھوڑا ہے۔ اس نے واضح کر دیا ہے کہ کامیابی کے خدائی مطالبات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے مطابق پورا کرنا ضروری ہے۔ اس میں غفلت ناکامی کا سبب بن جائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی واضح کر دیا ہے کہ عقل مندی یہی ہے کہ انسان خواہش پرستی سے نکل کر موت کے بعد والی زندگی کے لیے عمل تیار رکھے۔ بے وقوف ہے وہ جو خواہش نفس پوری کرتا رہے اور آخرت کے معاملے میں رب سے جھوٹی امیدیں باندھے رہے[۸]۔ بے حد درود و سلام ہو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپ نے بہت اذیتیں جھیل کر بھی کبھی اپنے اخلاقی وجود کو تحلیل نہ ہونے دیا اور ہر مرحلے پر خدائی مطالبے کو پورا کر دکھایا۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۸۔ سنن ترمذی، رقم ۲۴۵۹۔ 'الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والعاجز من أتبع نفسه هواها وتمنى على الله'۔

محمد حسن الیاس

انبیا کی تعلیمات کا دائرہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سوال: جب تمام انبیا اپنی اپنی قوموں میں بھیجے گئے اور ان کی تعلیمات اور شریعت بھی ان کی قوم تک مخصوص تھی تو پھر یہ کیوں نہیں کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی عرب قوم کی طرف بھیجے گئے اور ان کی لائی ہوئی تعلیمات اور شریعت بھی ان کی قوم کے لیے خاص تھی؟ قرآن کیسے ثابت کرتا ہے کہ قیامت تک ہم اسی شریعت کے پابند ہیں؟

جواب: اصل سوال کی طرف آنے سے پہلے تین بنیادی غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے:

پہلی یہ کہ:

یہ مقدمہ اپنی ذات ہی میں غلط ہے کہ انبیا کی تعلیمات کا دائرہ محض ان کی قوموں تک محدود ہے۔ انبیا کی ہدایت کا content ہمیشہ عالمی اور آفاقی ہوتا ہے، اس کی ہدایت کی presentation مقامی تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کو جب ایک قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے تو اس قوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے، اس کی ایک زبان ہوتی ہے، اسی طرح اس کے سماج اور کلچر میں کچھ رسوم و آداب ہوتے ہیں، اسی پس منظر میں ان کے ہاں انحرافات کی روایت جنم لیتی ہے۔ چنانچہ نبی جب بھی کسی قوم کو اپنی ہدایت پیش کرے گا تو وہ اسی مخصوص اطلاقی پس منظر میں کرے گا، لیکن جو بات وہ پیش کرے گا، اپنی واقعیت میں وہ ایک عالمی صداقت ہو گی۔

مثلاً رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کے عالمی مرکز کو شرک کی غلاظت سے پاک کیا، اس غلاظت کو پروان چڑھانے والے یقیناً قریش ہی تھے، آپ نے انھیں ہی مخاطب کیا، لیکن جو بات انھیں سمجھائی کہ خدا کا شریک ٹھیرانا ایک جھوٹ ہے، یہ بات ایک عالمی صداقت ہے، اس لیے تمام انبیا کی تعلیمات مقامی نہیں، بلکہ عالمی ہوتی ہیں۔

اسی طرح سے جو شریعت نبی لاتے ہیں، اس کا تعلق انسان اور اس کی عادات سے ہوتا ہے؛ جب تک وہ انسان اس دنیا میں اپنی انھی عادات کے ساتھ کھڑا ہے، شریعت کا ہر ہر حکم اس کے لیے relevant ہے۔

مثلاً شریعت نے وراثت میں بیٹوں کو بیٹیوں سے دگنا دینے کا حکم دیا تو اس کی وجہ ان کا بہ لحاظ منفعت بیٹیوں سے مختلف ہونا ہے، چنانچہ اگر یہ حقیقت پوری دنیا میں تبدیل نہیں ہوتی (اور نہ ہو گی) تو قانون کا یہ حکم بھی ابدی اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ انبیا میں سے جب خدا تعالیٰ کسی کو رسول کے منصب پر فائز کرتا ہے تو پھر دنیا میں اس کی قوم پر عذاب آتا ہے۔ یہ رسول کے ساتھ خدا کی معیت کا ظہور ہے جو دنیا میں ایک عدالت اور پھر اس کے تحت جزا و سزا کی صورت میں رو بہ عمل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے رسولوں کی عدالت یقیناً اپنی قوم تک محدود ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اسی بات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا.
(بنی اسرائیل ۱۷: ۱۵)

”ہم (کسی قوم کو) کبھی سزا نہیں دیتے جب تک ایک رسول نہ بھیج دیں (کہ سزا سے پہلے وہ اس پر حجت پوری کر دے)۔“

تیسری غلط فہمی یہ ہے کہ انبیا اس ہدایت کے موجد یا بانی نہیں ہوتے ہیں، تمام انبیا اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی دین لے کر آئے تھے۔ ارشاد ہوا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ

”اُس نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اُس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی، (اے پیغمبر)، ہم نے تمھاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ (اپنی زندگی میں) اِس دین کو قائم رکھو اور

یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡۤ اِلَیۡهِ مَنۡ یُّنِیۡبُ. (الشوریٰ ۴۲:۱۳)

اِس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ تم جس چیز کی طرف اِن مشرکوں کو بلا رہے ہو (کہ یہ خدا کو ایک مانیں)، وہ اِن پر بہت شاق گزر رہی ہے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی طرف آنے کے لیے چن لیتا ہے، لیکن اپنی طرف آنے کی راہ وہ اُنھی کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی پیدایش کے ساتھ ہی خیر و شر کا وہ ابتدائی علم عطا کیا تھا جس کی روشنی میں وہ معروف اور منکر کی تمیز بہ آسانی کر سکتا تھا۔ قرآن مجید نے اسی ضمن میں بتایا:

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا. فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا. قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا. وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا. (الشمس ۹۱:۷-۱۰)

"اور نفس گواہی دیتا ہے، اور جیسا اُسے سنوارا، پھر اُس کی نیکی اور بدی اُسے سجھا دی کہ مراد کو پہنچ گیا وہ جس نے اُس کو پاک کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اُسے آلودہ کر ڈالا۔"

اس ابتدائی بصیرت کے باوجود انسان کو زندگی میں جو مشکلات پیش آسکتی تھیں، وہ دو ہی تھیں:

پہلی یہ کہ اس کے ارادہ و اختیار کا سوءِ استعمال اس داخلی شعور کو مٹا نہ دے۔

دوسری یہ کہ انسان اپنے شعور سے جن معاملات میں فیصلے کی صلاحیت نہیں رکھتا، ان میں کیا کرے؟

ان مشکلات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اس کے شعور کی یاددہانی کے لیے اپنی جانب سے پیغمبر بھیجنے کا اہتمام کیا، خدا کے یہ نمایندے زمین پر لوگوں کو ان کی زبان میں خدا کا کلام پڑھ کر یاددہانی کراتے اور خیر و شر کی تمیز پر توجہ دلاتے، اس کے نتیجے میں وہ لوگ جن میں نور فطرت کی ذرا بھی روشنی باقی ہوتی ہے، لپک کر اس پیغمبر کی ہدایت کو قبول کر لیتے۔

اسی طرح خدا کے یہ نمایندے دوسری مشکل بھی حل کرتے، وہ معاملات جن میں خیر و شر کے اس فطری علم کو اطلاق میں مشکلات درپیش ہوتیں، خدا کا کلام سنا کر شریعت و قانون بھی بیان کر دیتے۔ یہ قانون ایسا نہیں ہے کہ اپنی روح میں ہر پیغمبر کے ہاں مختلف ہوتا ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک پیغمبر کے ہاں خدا کی بارگاہ میں پاک ہو کر حاضر ہونا شریعت تھی اور دوسرے کے ہاں نہیں تھی، بلکہ شریعت کے یہ قوانین کبھی معاشرتی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حقائق، کبھی منصبی حیثیت اور کبھی تدریجی اور تربیتی مقاصد کے لیے مختلف صورتوں میں سامنے آتے ہیں:

۱۔ مثلاً اگر کسی قوم میں کوئی نظم اجتماعی نہیں ہے تو شریعت کا مخاطب ہر صورت میں فرد ہی رہے گا، یہ ابتداے انسانیت کے انبیا کی شرائع میں ہو سکتا ہے۔

۲۔اسی طرح اگر کوئی قوم خدا کی طرف سے کسی ذمہ داری پر فائز ہے تو خدا کی جانب سے خصوصی رعایت اور سختی، دونوں پہلو اس کے قانون میں نمایاں ہوں گے۔

۳۔ اسی طرح تدریج اور تربیت کے لیے بعض وقتی احکام بھی تمام شرائع میں اسی غرض سے دیے جاتے رہے ہیں کہ انسانوں کو اس اصل قانون کی پاس داری تک پہنچا دیا جائے۔اس کی مثال خود رسول اللہ کی زندگی میں دیے گئے بعض احکام ہیں، جیسا کہ صدقہ دے کر آپ سے ملاقات کرنا۔

اب آتے ہیں اس اصل سوال کی طرف کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی نوعیت کیا ہے؟ اور قرآن مجید اس ضمن میں کیا رہنمائی کرتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کی طرف مبعوث فرمایا اور یہ ہدایت کی:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ.

(الشعراء ۲۶: ۲۱۴)

''اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ۔''

یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ رسول اللہ ہی کا خاندان تھا جس کے پاس بیت اللہ کی تولیت تھی۔یہی بات اللہ تعالیٰ نے دوسرے موقع پر مزید واضح فرما دی:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا.(الانعام ۶: ۹۲)

''یہ (اُسی کتاب کی طرح) ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، بڑی خیر و برکت والی ہے، جو کچھ اِس سے پہلے آ چکا ہے، اُس کی تصدیق کرتی ہے، (اِس لیے کہ تم اِس کے ذریعے سے لوگوں کو خوش خبری دو) اور اِس لیے کہ اُنھیں متنبہ کر دو جو ام القریٰ اور اُس کے گردوپیش کے رہنے والے ہیں۔''

چنانچہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ کے مخاطبین بنی اسمٰعیل ہی تھے اور آپ کو ان تک دعوت

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پہنچانے کی ذمہ داری دی گئی، اور آپ انھی کے لیے عدالت بن کے آئے، لیکن جو پیغام قرآن مجید کی صورت میں آپ پہنچا رہے تھے، کیا وہ صرف بنی اسمٰعیل کے لیے تھا؟اس کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید نے رسول اللہ کی زبانی بتایا:

وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ. (الانعام ۶:۱۹)

''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعے سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔''

یعنی بنی اسمٰعیل کے علاوہ بھی جس شخص تک یہ پہنچ جائے، اس کے لیے ہدایت ہے۔

استاذ جاوید احمد غامدی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ وہی بات ہے جو سورۂ فرقان میں 'لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرًا' (بڑی ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان اتارا ہے، اِس لیے کہ وہ دنیا والوں کے لیے نذیر بنے) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآن روز قیامت تک ذریعۂ انذار ہے۔ علما جب اِس کی دعوت لے کر اُٹھیں تو اُنھیں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجاے اِسی کو ذریعۂ انذار بنانا چاہیے۔ خدا کی معرفت اور عقبیٰ شناسی کے لیے اِس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے جو لوگوں کو بیدار کر سکے۔'' (البیان ۲/ ۲۰)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسمٰعیل کو بھی پابند کیا کہ جو ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تک پہنچائی ہے، اسے باقی دنیا تک پہنچائیں، اس ذمہ داری کو قرآن مجید نے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا. (البقرہ ۲:۱۴۳)

''اِسی طرح ہم نے تمھیں بھی ایک درمیان کی جماعت بنا دیا ہے تاکہ تم دنیا کے سب لوگوں پر (حق کی) شہادت دینے والے بنو اور اللہ کا رسول تم پر یہ شہادت دے۔''

استاذ جاوید احمد غامدی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اصل میں لفظ 'وَسَط' استعمال ہوا ہے۔ یہ 'ولد' کی طرح مذکر، مونث، واحد اور جمع سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اِس کے معنی درمیان کے ہیں اور اِس آیت میں یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم بنی اسمٰعیل کے لیے آیا ہے۔ سورۂ حج (۲۲) کی آیت ۷۸ میں 'هُوَ اجۡتَبٰكُمۡ' کے الفاظ دلیل ہیں کہ اُنھیں اللہ تعالیٰ

نے دین کی اِس شہادت کے لیے اُسی طرح منتخب کیا، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت ورسالت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی اِس آیت میں قرآن نے اِسی بناپر اُنھیں درمیان کی ایک جماعت 'اُمَّۃً وَّسَطًا' قرار دیا ہے، یعنی وہ جماعت جس کے ایک طرف اللہ ورسول اور دوسری طرف دنیا کی سب اقوام تھیں اور وہ اُن پر حق کی شہادت کے لیے مامور کیے گئے۔ شہادت کے معنی گواہی کے ہیں۔ جس طرح گواہی سے فیصلے کے لیے حجت قائم ہو جاتی ہے، اُسی طرح حق جب اِس درجے میں واضح کر دیا جائے کہ اُس سے انحراف کی گنجایش باقی نہ رہے تو اُسے 'شہادت' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرد یا جماعت کو اپنی دینونت کے ظہور کے لیے منتخب فرماتے اور پھر قیامت سے پہلے ایک قیامت صغریٰ اُن کے ذریعے سے اِسی دنیا پر برپا کر دیتے ہیں۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہیں گے تو اِس کی جزا اور انحراف کریں گے تو اِس کی سزا اُنھیں دنیا ہی میں مل جائے گی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اُن کا وجود لوگوں کے لیے ایک آیت الٰہی بن جاتا ہے اور وہ خدا کو گویا اُن کے ساتھ زمین پر چلتے پھرتے اور عدالت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اِس کے ساتھ اُنھیں حکم دیا جاتا ہے کہ جس حق کو وہ بچشم سر دیکھ چکے ہیں، اُس کی تبلیغ کریں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت بے کم وکاست اور پوری قطعیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچا دیں۔ یہی شہادت ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہے تو دنیا اور آخرت، دونوں میں فیصلۂ الٰہی کی بنیاد بن جاتی ہے۔" (البیان ۱/ ۱۴۲-۱۴۳)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قرآن مجید نے اپنے اولین مخاطبین کو پابند کیا کہ اس کا یہ پیغام ہر جگہ پہنچائیں تاکہ عالمی سطح پر خدا کا پیغام پھیل جائے اور حق و باطل کا فیصلہ ہمیشہ تک کے لیے ہو جائے، انھوں نے اس دعوت کا آغاز اس عہد کے یہودیوں اور نصاریٰ تک یہ پیغام پہنچا کر کیا۔ قرآن مجید کی ابتدائی سورتیں اسی دعوت کی سرگذشت ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور اکناف عالم میں یہ پیغام پھیل گیا۔

اب جیسے ہی بنی اسمٰعیل کی یہ دعوت قرآن کی صورت میں ہم غیر بنی اسمٰعیل تک پہنچتی ہے اور ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ ہی کی حقیقی ہدایت ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نے قرآن و سنت کی صورت میں آگے پہنچایا ہے تو ہم بھی اس ہدایت کے لیے انھی دو پہلوؤں سے محتاج تھے: ایک یاددہانی اور دوسرے قانون۔ چنانچہ اب ہمارے لیے بھی اس پیغمبر پر اور اس ہدایت پر ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اس رسول پر ایمان لانا، دراصل ہمارے خدا پر ایمان کی نشانی ہے کہ ہم خدا اور اس کی طرف سے بھیجے

ہوئے پیغام کو مان رہے ہیں، اور جیسے ہی ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، تذکیر اور شریعت کی وہ ساری ہدایات جو بنی اسمٰعیل سے متعلق تھیں، ہم سے بھی متعلق ہو جاتی ہیں، اس لیے کہ ان کا تعلق اس اصل پیغام سے ہے جس کو ہم نے قبول کر لیا ہے۔ لہٰذا اب نماز ویسے ہی ہم پر لازم ہے، جیسے بنی اسمٰعیل پر تھی، کیونکہ ہمیں بھی اللہ سے تعلق کے اظہار کی ویسے ہی ضرورت ہے، جیسے بنی اسمٰعیل کو تھی۔ ہمیں ویسے ہی خدا کے قانون، یعنی شریعت کا پابند کیا گیا ہے، جیسے بنی اسمٰعیل کو کیا گیا تھا۔

اس ہدایت میں، البتہ چند ایسے احکامات یقیناً ہم سے متعلق نہیں ہوتے جو رسول کی عدالت اور بنی اسمٰعیل کو ان کی خاص حیثیت میں دیے گئے تھے۔ اس نوعیت کے دینی احکام کی تفصیل اور ان کی تخصیص کے وجوہ خود قرآن مجید نے بیان کر دیے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے وہ ایک سچی حقیقت ہیں، جو اس پیغمبر کی صداقت کی دلیل ہیں۔ ہمارے ایمان کی بنیاد ہیں، لیکن ہم ان احکام کے جس طرح مخاطب نہیں، اسی طرح ان پر عمل کرنے کے پابند بھی نہیں ہیں۔ مثلاً رسول کے اتمام حجت کے بعد نہ ماننے والوں کا قتال۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Trusted Name for Last 65 years

Best Treatment for Your Branded Kurtas, Bosky
Ladies' Shalwar Suits, Trousers, Dress Shirts & Jackets

Since 1949
Snowhite
DRYCLEANERS
Largest Cleaning Network ... COUNTRYWIDE!

TQCSI
Quality Certified
ISO 9001 : 2000

Brands of the year Award
IT'S ALL ABOUT CHAMPIONS
2011-2012

Web: www.snowhite.com.pk
Tel: 021-38682810

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com